. . . . . قطع نہیں کرتے پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی بروقت عمل کرتے اور دلائل منع بدعات پر بھی عمل کرتے ہیں اہل بدعات کو دونوں امر نصیب نہیں ۔ خلاصہ یہ ہوا کہ فرح مامور بہ کے تین درجے ہیں۔ افراط، تفریط، اعتدال ۔ تفریط تو یہ ہے کہ تحدید بالحاء المہملۃ کر دیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح ہوگی جیسا محض خشک مزاجوں کے کلام سے مترشح ہوگیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو حلدی رکھیں مگر حدود شرعیہ سے تجاوز کریں ۔ جیسا کہ اہل تجدید بالجیم المعجمۃ کا طریق متعارف ہوگیا اور اعتدال ادائے امت میں ہے پس نہ ہم محدد ہیں نہ مجدد بلکہ قدیم ہیں والحمد للہ علی ذالک ۔

دوسرا استدلال اور اس کا جواب

دوسرا استدلال موجدین کا۔ اس حدیث سے ہو سکتا ہے کہ جب ابو لہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خبر سنی تو خوشی میں آکر ایک باندی کو آزاد کر دیا اور اس پر عقوبت میں تخفیف ہوگئی ۔ پس معلوم ہوا کہ ولادت پر فرح جائز ہے اور موجب برکت ہے ۔ جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت[1] کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس پر ہر وقت عامل ہیں گفتگو تو اس ہیئت کذائیہ میں ہے ۔

تیسرے استدلال کا جواب

تیسرا استدلال اس آیت سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ۔ وَاِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الی قولہ) رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۔ یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما دیں ۔ عیسیٰ کی اس دعا تک اے اللہ ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے عید بن جائے ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہو چکا ہے کہ امم سابقہ کے شرائع اگر حق تعالیٰ ہم پر نقل فرما کر ان پر انکار نہ فرما دیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہیں، اور یہاں کوئی انکار نہیں پس معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمت عظمیٰ ہے پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا ۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار اسی جگہ ہو، جہاں وہ منقول ہے دیکھئے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ط

---

[1] خوشی

میں سجدہ تحیت منقول ہے اور سجدہ تحیت اور سجدہ تعظیمی ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکا لیکن یہاں پر اس پر انکار منقول نہیں ۔ اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں ۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیات و احادیث ہم نے عید بنانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں وہ اس پر انکار کے لئے کافی ہیں ۔ یہ جواب تو اس تقدیر پر ہے جب کہ آیت کے معنیٰ یہی ہوں جو مستدل نے بیان کئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول مائدہ کی تاریخ کو عید بنا دیں، اس لئے کہ تکون میں ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے پس اس سے یوم نزول المائدہ لینا مجاز ہوگا ۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنیٰ بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے گا پس معنیٰ یہ ہیں کہ تکون المائدۃ سرورا لنا، یعنی وہ مائدہ ہمارے لئے سرور کا باعث ہو جاوے ۔ عید کے معنیٰ متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے یہ کیا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلاد النبی ہی مراد ہو جیسے حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م، ت، ع آتا ہے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں ان کے نزدیک جہاں گویا شیخ سعدی رحؒ کے شعر ؎

؎ تمتع زہر گوشہ یافتم ،، سے یہی متعہ نکلتا ہے ۔ اور آیت ،، رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ کے بھی یہی معنیٰ ہیں کہ اے رب ہمارے بعض نے بعض سے متعہ کیا ہے ۔ ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع، ی، د، آوے اس سے عید میلاد النبی کا جواز ثابت ہوتا ہے ۔

چوتھا استدلال اور اس کا جواب

چوتھا استدلال اس قصہ سے ہو سکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمر سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے . . . ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے دن ہی نازل ہوئی ہے یعنی یوم جمعہ اور یوم عرفہ کو نازل ہوئی ہے اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے نزلت فی یوم جمعۃ وعرفۃ یہ حدیث کا مضمون ہے تقریر استدلال کی اس آیت سے یہ ہے کہ حضرت عمر و ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا معلوم ہوا کہ عطائے نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اگرچہ یہ استدلال ان کو قیامت تک نہ سوجھتا ۔ لیکن ہم نے تبرعاً نقل کیا ہے کہ ان کو اس میں بھی گنجائش ہو سکتی ہے ۔ اس کے دو جواب ہیں ۔ ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا ۔ تو یہ کیا ضرور ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو ۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے تعریف یعنی یوم عرفہ حجاج کے مشابہت سے جمع ہونے پر

انکار فرمایا ہے ۔ یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں ۔ نیز حضرت ابن عباس رضؓ نے تحصیب کو لیس بشیٔ کہا ہے حالانکہ وہ منقول بھی ہے مگر صرف عادت کو عبادت سمجھنے سے انہوں نے یہ انکار فرمایا تو غیر منقول کو قربت سمجھنا ۔ تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا ۔ اور حضرت عمر رضؓ کا انکار اجماع علی شجرۃ الحدیبیہ پر مشہور ہی ہے ۔ پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہوگیا ۔ گو ہر ہر مقام پر انکار منقول نہ ہو ۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا یہودی تھا ۔ اس کا خاص طور پر الزامی جواب دیا کہ ہمارے یہاں تو پہلے سے عید ہے بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنا ناجائز نہیں یعنی مطلب حضرت عمر رضؓ کا یہ ہے کہ ہماری شریعت میں چونکہ تعیید جائز نہیں ہے اس لئے ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے تھے ۔ مگر خدائے تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس یوم کو عید بنا دیا ۔

پانچواں استدلال اور اس کا جواب

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ کر سکتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن روزہ رکھا ۔ کسی نے پوچھ پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا ۔ ذالک الیوم الذی ولدت فیہ ۔ یعنی میں اس دن میں پیدا ہوا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم الولادت عبادت اور قربت کا دن ہے اور فرحت و سرور علی الولادت قربت ہے لہذا یہ جائز ہے ۔ اس کے بھی دو[۲] جواب ہیں ۔ اول تو یہ کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ یوم ولادت ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے اس لئے کہ دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعرات اور پیر کو نامہ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزے کی حالت میں پیش ہوں ۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت صوم کی غرض اعمال ہے ۔ بس جب یہ علت ہوئی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت ہوگا اور مدار حکم کا علت ہوتی ہے ۔ اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہیں تو تم نے حکمت حکمت کو اصل علت ٹھہرایا ۔ حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا ۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علت حکم کی یہی ہے لیکن علت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علت جو اپنے مورد کے ساتھ خاص ہو اور ایک وہ جس کا تعدیہ دوسری جگہ بھی ہو ۔ اگر یہ علت متعدیہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہما کیوں منقول نہیں اور نیز مثل یوم الاثنین کے یوم ولادت ہے تاریخ ولادت میں بھی کہ ۱۲ ربیع الاول ہے روزہ رکھنا چاہیئے دوسرے یہ کہ نعمتیں اور بھی ہیں مثلاً ہجرت ، فتح مکہ ، معراج وغیرہا ، آپ نے ان کی علت سے کیوں کوئی عبادت نہ

فرمائی ۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام ہے بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے اور اصل مدار روزہ رکھنے کا وحی ہے باقی حکمت کے طور پر ولادت کو ذکر فرمایا ورنہ دوسری نعمتوں کے دن بھی روزہ و تعیید چاہیئے ، اور اگر اس پر کہا جاوے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے تمام نعمتوں کی ۔ پس ولادت اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے ۔ اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص کی گئی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ حمل اس کی بھی اصل ہے اس کو اصل ٹھہرانا چاہیئے ۔ پھر حیرت یہ ہے کہ یوم الولادت دوشنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تاریخ ولادت یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید مناویں ۔ یوم الاثنین میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت بھی کی ہے اور تاریخ ولادت میں تو کچھ بھی منقول نہیں ہے پس اس دلیل کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ ہر ہر پیر کو عید کیا کریں ۔ غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجدین کا ثابت نہیں ہوتا ۔ یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے

عقلی دلائل کا جواب

اب ہم اس باب میں عقلی گفتگو کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں میں بعضے عقل پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے جو راجع ہیں ملک اور قوم کی طرف ۔ اس لئے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کئے دیتے ہیں جاننا چاہیئے کہ جس قدر عبادت شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہیں ۔ ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس اعتبار سے مامور بہ کی چند قسمیں نکلتی ہیں ۔ اول تو یہ کہ سبب میں تکرار ہو یعنی سبب بار بار پایا جاتا ہو سبب کے مکرر ہونے سے مسبب بھی مکرر پایا جاویگا ، مثلاً وقت صلوٰۃ کے لئے سبب ہے پس جب وقت آوے گا صلوٰۃ بھی واجب ہوگی ۔ اسی طرح صیام رمضان کے لئے شہود شہر سبب ہے ۔ جب شہود شہر ہوگا صوم واجب ہوگا اور عید کے لئے فطر اور اضحیہ کے لئے یوم اضحیہ بھی اسی باب سے ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسبب بھی ایک اور سبب بھی ایک جیسے بیت اللہ شریف حج کے لئے ۔ چونکہ سبب ایک ہے اس لئے مامور بہ یعنی حج بھی عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے ۔ یہ دونوں قسمیں تو مدرک بالعقل ہیں اسی لئے کہ عقل بھی اسی کو مقتضی ہے کہ سبب کے تکرار اور توحد[۱] سے مسبب متکرر[۲] اور متوحد[۳] ہو تیسری قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور مسبب کے اندر تکرار ہو ، جیسے حج کے طواف میں رمل کا سبب ارارۃ قوت تھی اب وہ ارارۃ قوت تو ہے نہیں اس لئے کہ قصہ اس کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان حج کے لئے مکہ معظمہ آئے تو مشرکین نے کہا تھا ان لوگوں کو یثرب کے بخار نے ضعیف اور ریودا کر دیا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں یعنی شانے ہلاتے

---

[۱] ایک ہونا [۲] مکرر ہونا [۳] ایک ہونا ۔

ہوئے اکڑ کر طواف کرو تاکہ ان کو قوت مسلمین کی مشاہدہ ہو۔ اب وہ سبب تو ہے نہیں لیکن مامور بہ یعنی رمل فی الطواف بحالہ باقی ہے۔ یہ امر غیر مدرک بالعقل ہے اور جو عمل خلاف قیاس ہوتا ہے اس کے لئے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گذر گئی یا بار بار آتی ہے ظاہر ہے کہ وہ ختم ہوگئی، کیونکہ اب جو ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ آتی ہے۔ وہ اس خاص یوم الولادت کی مثل ہوتی ہے نہ کہ عین اور یہ ظاہر ہے۔ پس مثل کے لئے وہی حکم ثابت ہونا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا بوجہ غیر مدرک بالعقل ہونے کے قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا۔ لیکن یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الاثنین میں روزہ رکھنے کی وجہ ولدت فیہ سے فرمائی ہے تو اس میں بھی یہ کلام ہوسکتا ہے کہ یوم الولادت تو گذر گیا ہے اب یہ اس کا مثل ہے اس کو حکم اصل کا کیوں ہوا۔ جواب یہ ہے کہ یہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے اس لئے اس پر قیاس نہیں ہوسکتا۔ اب ہم ترعًا ان حضرات کو بھی ایک دلیل عقلی لکھ کر اور اس کا جواب دیکر مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ مقابلہ ہے اہل کتاب کا کہ وہ ولادت مسیح علیہ السلام کے دن عید کرتے ہیں ہم مقابلہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت میں عید کرتے ہیں تاکہ اسلامی شوکت ظاہر ہو۔ جواب یہ ہے کہ یہ تو اس وقت کسی درجہ میں صحیح ہو، ہمارے یہاں اظہار شوکت کے لئے کوئی شئی نہ ہو، ہمارے یہاں جمعہ عیدین سب اظہار شعائر اسلام کے لئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کا مقابلہ ہی کرنا مقصود ہے تو ان کے یہاں اور دنوں میں بھی عیدیں اور میلے ہوتے ہیں تم کو بھی چاہیئے کہ ہر ہر دن کے مقابلہ میں تم بھی عید کیا کرو۔ اسی طرح عاشورہ کے دن تعزیہ داری بھی کیا کرو، تاکہ اہل تشیع کا مقابلہ ہو۔ چنانچہ بعض جاہل محض مقابلہ کے لئے ایسا کرتے بھی ہیں اور جناب اگر یہی مصلحت ہے تو ہندوؤں کے یہاں ہولی دیوالی ہوتی ہے ان کے مقابلہ کے لئے ہولی دیوالی کیا کرو۔

ایک قصہ میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اصل اور قاعدہ آپ کا بالکل بے اصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کفار نے ایک درخت بنا رکھا تھا اس پر ہتھیار لٹکائے تھے اور اس کا نام ذات انواط رکھا تھا۔ بعض صحابہ رضی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ" اجعل لنا ذات انواط "یعنی یا رسول اللہ ہمارے لئے بھی آپ ایک ذات انواط مقرر فرما دیجئے یعنی کوئی ایسا درخت ہمارے لئے بھی آپ مقرر فرما دیجئے کہ اس پر ہم ہتھیار اور کپڑے وغیرہ لٹکا دیا کریں۔ دیکھئے بظاہر اس میں کچھ حرج معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کسی درخت پر کپڑے یا ہتھیار لٹکا دینا ایک امر مباح ہے اس میں تشبیہ بھی کچھ نہیں لیکن صورۃً ان

کی مشابہت تھی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک متغیر ہوگیا اور فرمایا سبحان اللہ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے قوم موسیٰ علیہ السلام نے موسیٰ ع سے کہا تھا۔ اِجْعَلْ لَنَا اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ۔ پس جب اس مشابہت کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا تو جس صورت میں ان کی پوری شکل بنائی جائے یہ تو بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا یہ اس باب میں گفتگو تھی جو اختصار کیساتھ بیان کی گئی ہے غرض عقل سے نقل سے ہر طرح بحمد اللہ ثابت ہوگیا کہ یہ عید مخترع ناجائز اور بدعت واجب الترک ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو فرحت کا حکم ہوا ہے اور اس کی تحدید یا تجدید کا حکم نہیں بلکہ فرح دائم اور مسرت دائمی کا حکم ہے اس لئے کسی خاص دن کو اس کے لئے مخصوص نہ کریں اور ہر وقت اسی آیت پر عمل کریں (السرور صـ۲۹)

۲۳ - پختہ قبریں بنانا خلاف شرع اور اہل اللہ کے مذاق کے خلاف ہے

حضرات اولیاء اللہ کے مزارات اسی تعظیم کی وجہ سے بڑے عالی شان پختہ بنائے جاتے ہیں یہاں بھی منشاء وہی عظمت ہے مگر اس کا ظہور بری طرح ہوا کیونکہ شرعًا تعظیم اولیاء کی یہ صورت حرام ہے اہل اللہ کی تعظیم کچھ اسی میں منحصر نہیں کہ ان کے مزارات پختہ بنائے جائیں وہ تو کچی قبریں بھی ویسے ہی معظم و محترم ہیں جیسے پکی قبریں بلکہ کچی قبروں پر بوجہ موافقت سنت کہ انوار زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ بختیار کاکیؒ کی کچی قبر پر ایسی ہیبت برستی ہے جو سلاطین کی قبروں پر خاک بھی نہیں اور اگر کسی کے آنکھیں ہوں تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ کچی قبر پر جو انوار ہیں وہ پختہ قبر پر کہاں۔ اور اگر کسی کی آنکھیں بند ہوں تو وہ اس دلیل ہی سے سمجھ لے کہ اول تو انوار سنت کے ساتھ مخصوص ہیں دوسرے پختہ مزارات تمام تر روساء اور امراء اور سلاطین کے بنائے ہوئے ہیں بزرگوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ امراء اور سلاطین کی بنائی ہوئی چیز میں انوار کہاں؟ اور اہل اللہ کو اپنے بدن تک کی تو پرواہ نہیں ہوئی۔ پھر یہ جو چلے قبروں کے پختہ و آراستہ بنانے کے ان میں کہاں سے آجاتے ہیں۔ یقینًا یہ بزرگوں کا کام نہیں بلکہ سلاطین و امراء کے جو چلے ہیں انہیں کو ایسی باتیں سوجھا کرتی ہیں جو سلاطین ورؤساء دین

[1] من گھڑت

سے ناآشنا ہیں ان کو تو دوسری طرح کے فسق و فجور کے چوچلے سوجھتے ہیں اور جن کو ذرا دین سے کچھ تعلق اور دینداروں سے کچھ محبت ہے ان کو پختہ مزار بنانے کے اور بدعات کے چوچلے سوجھتے ہیں۔ جیسے ایک رئیس حضرت مولانا گنگوہیؒ کے واسطے ایک نہایت قیمتی خوشنما بھڑکدار پوستین لائے تھے کہ حضرت اس کو پہنا کریں۔ مولانا نے اسے ایک نواب صاحب کو دیدیا اور فرمایا کہ نواب صاحب اس کو آپ پہن لیجئے آپ کے کپڑوں پر اچھی لگے گی کیونکہ آپ کا اور لباس بھی اس کے موافق قیمتی ہوگا۔ اور میں لٹھے، گاڑھے دھوتر کے اوپر اس کو پہن کر کیا اچھا لگوں گا پھر اس کی حفاظت کیڑے سے کون کریگا مجھے اتنی فرصت نہیں فضول اس کو رکھ کر کبھی ضائع کروں۔ غرض اہل اللہ جب اپنے بدن کے واسطے یہ جھگڑے پسند نہیں کرتے تو قبروں کے لئے ان خرافات کو کیسے پسند کریں گے یہ پختہ مزارات اہل اللہ کے مذاق کے بالکل خلاف ہے۔ پھر یہ قبر کے وضع کے بھی خلاف ہے کیونکہ قبروں کی زیارت سے جو مقصود ہے وہ ان پختہ قبروں سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

زیارت قبور کا منشاء

زیارت قبور سے غرض ہے کہ موت یاد آئے اور دنیا کے زوال و فنا کا نقشہ سامنے آجائے تو یہ بات کچی اور شکستہ قبروں ہی سے حاصل ہوسکتی ہے شکستہ قبر سے دل پر اثر ہوتا اور موت یاد آتی ہے۔ ان شاہی قبروں سے موت تھوڑا ہی یاد آتی ہے نہ زوال دنیا پیش نظر ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ایسی قبروں سے بزرگوں کی محبت و عظمت تو دل میں آتی ہے تو میں کہوں گا یہ محبت تعزیوں والی جیسی ہے کہ ان کو بدون تعزیہ بنائے اور مرثیہ گائے شہداء پر رونا نہیں آتا سچی محبت و عظمت کو اس ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت نہ تھی ان کو تو ایسی محبت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی کبھی زمین پر نہ گرتا تھا بلکہ صحابہؓ اس کو ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ اور آنکھوں پر ملتے تھے۔

صحابہ کا عمل

مگر پھر بھی صحابہؓ نے حضورﷺ کی قبر پختہ نہیں بنائی بلکہ کچی ہی رکھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ قبر بنانے سے منع فرمایا ہے تو پس محبت و عظمت نبوی کا تقاضا یہی تھا کہ قبر پختہ نہ بنائی جائے اور ظاہر ہے کہ اولیاء اللہ اپنی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر جان و مال سے فدا تھے پس جس بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ہے اسی میں اولیاء اللہ کی بھی خوشی ہے اگر یہ کہا جائے کہ پختہ قبر بنانے میں اہل اللہ کے نشان کا بقاء ہے تو اس کے جواب میں اول تو میں یہ کہتا ہوں کہ خدا ان کو باقی رکھنے والا ہے تمہارے باقی رکھنے سے وہ باقی

رکھنے سے وہ باقی نہیں رہ سکتے۔ دیکھو بہت سی پختہ قبر والے مردے ایسے بھی ہیں جن کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں تو کیا پختہ قبر ہی بنانا بقاء کا ذریعہ ہے ہرگز نہیں باقی اصل رکھنے والی چیز اہل اللہ کی ولایت اور ان کے کمالات معرفت و محبت ہیں پس وہ آپ کی ابقاء کے محتاج نہیں۔ عارفؒ فرماتے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور مولانا نیاز فرماتے ہیں ؎

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز — عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

کچی قبریں

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ نشان باقی رکھنے کی یہ بھی صورت ہے کہ قبر کچی رکھو اور ہر سال اس کی لیپ پوت کرتے رہو۔ مٹی ڈلواتے رہو اور ایک عجیب تماشا ہے کہ اہل دنیا پکی قبر اس بزرگ کی بنواتے ہیں کہ جس کو اپنے زعم میں پورا متبع سنت نہیں سمجھتے اور جس کو متبع سنت سمجھتے ہیں اس کی قبر کچی ہی بناتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی قبر کچی ہے اور وہاں عورتیں بھی حاضر نہیں ہوتیں ان کے مجاوروں سے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا حضرت متبع شریعت بہت تھے اس لئے ان امور کو جائز نہیں رکھا گیا۔ گویا نعوذ باللہ دوسرے اولیاء اللہ متبع شریعت نہ تھے تو اس فعل سے اپنے بزرگوں پر ایک سخت الزام لگانا ہے کہ یہ متبع شریعت نہ تھے۔ سو اس وجہ سے بھی یہ فعل قابل ترک ہے۔

پختہ قبر ممنوع ہے

قبر پختہ بنانا شریعت میں ممنوع ہے اور اس کے ممنوع ہونے کی ایک اور حکمت سمجھو وہ یہ کہ پکی قبر بنانے سے جو شریعت نے منع کیا ہے حقیقت میں یہ ہم پر بڑا احسان کیا کیونکہ اگر ابتداء سے اس وقت تک سب قبریں پختہ ہی ہوتیں تو آدمیوں کو تو رہنے کے لئے جگہ بھی نہ ملتی نہ زراعت کے لئے زمین ملتی کیونکہ مردے اس قدر گذرچکے ہیں کہ کوئی حصہ زمین کا مُردوں سے خالی نہیں۔ بتلائیے اگر سب کی قبریں پختہ ہوتیں تو ہمارے لئے کہاں ٹھکانا ہوتا۔ پس قبروں کے اوپر دو منزلہ سہ منزلہ مکان بناتے جو ایک پہاڑ سا ہوجاتا۔ اور کچی قبریں تو یہ بات ہے کہ جب نشان مٹ گیا تو اب وہاں دوسری قبر بنا سکتے ہیں اور اگر زمین وقف نہ ہو تو اس پر اتنی مدت کے بعد زراعت بھی کرسکتے ہیں جس میں یہ یقین بھی ہوجائے کہ مردہ کا جسم خاک خوردہ ہوگیا ہوگا۔ اور یہ بات کہ ہر جگہ مُردے ہیں زندوں کی مردم شماری پر نظر کرکے سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب ایک زمانے میں اتنے آدمی جمع ہیں تو اس چھ سات ہزار سال کی مدت میں کس قدر بے شمار ہوں گے اور ہر شخص کی قبر کے لئے کتنی جگہ ضروری ہوتی ہے تو زمین میں اتنی جگہ کہاں تھی اور اسی حساب پر نظر کرکے اہل سائنس

یہ کہتے ہیں کہ اگر آج سب زندہ ہوتے تو اس زمین پر رہنے کی جگہ نہ ملتی۔ غرض قبروں کے پختہ ہونے سے یہ تنگی ہوتی اور اب تو انہی کے دفن ہونے کی جگہ میں سب بس رہے ہیں ان ہی کے مدفن بلکہ خود ان کے جسد کی مٹی سے مکان بنا رہے ہیں۔ برتن بنا رہے ہیں ممکن ہے کہ ہمارے گھروں کے گھڑے، صراحی، پیالے ہمارے بزرگوں کی مٹی کے بنے ہوئے ہوں تو قبر کا پختہ بنانا ان مفاسد پر مشتمل ہے علاوہ اس کے موت تو مٹانے ہی کے واسطے ہے اس کے بعد بقا کا سامان کرنا ایک امر فضول ہے۔

قبروں سے فیض کا سوال

اس پر اگر کوئی کہے کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے اس لئے قبروں کی بقا کی ضرورت ہے تو میں اس کے وقوع کا انکار نہیں کرتا۔ مگر اول تو وہ فیض معتد بہ نہیں کیونکہ قبروں سے جو فیض ہوتا ہے وہ ایسا نہیں جس سے تکمیل ہو سکے یا سلوک طے ہو سکے بلکہ اس کا درجہ صرف اتنا ہے کہ صاحب نسبت کی نسبت کو اس سے کسی قدر قوت ہو جاتی ہے۔ غیر صاحب نسبت کو تو خاک بھی فیض نہیں ہوتا صرف صاحب نسبت کو اتنا فیض ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے نسبت کو قوت اور حالت میں زیادت ہو جاتی ہے مگر وہ بھی دیرپا نہیں ہوتی بلکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے تنور کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے جسم میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے کہ جہاں تنور سے ہٹے اور ہوا لگی اور وہ سب گرمی جاتی رہی اور زندہ مشائخ سے جو فیض ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مقوی دوا کھا کر قوت وحرارت حاصل ہوتی ہے کہ وہ تمام جسم میں پیوستہ ہو جاتی ہے پس صاحب نسبت کو اول تو قبر سے فیض لینے کی ضرورت نہیں۔ زندہ شیخ اس کے لئے قبروں سے زیادہ نافع ہے اور ضرورت بھی ہو تو صاحب نسبت کے لئے قبر کا پختہ ہونا ضروری نہیں وہ تو آثار سے معلوم کرے گا کہ یہاں کوئی صاحب کمال مدفون ہے پس یہ وجہ بھی کالعدم ہو گئی۔

(الفاظ القرآن ص ۵۶)

۲۴ - ربیع الاول کی مخصوص تاریخ میں میلاد کی ممانعت

ربیع الاول کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے،

کیونکہ یہ مہینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و تشریف آوری کا ہے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تقاضہ کے ساتھ دل میں پیدا ہوتی اور ایک خاص تحریک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی ہوتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ منکرات منضم نہ ہوتے تو اس ماہ میں یہ حالت اور اس حالت میں آپ کا ذکر کرنا علامت محبت ہوتی۔ مگر افسوس ہے کہ منکرات کی وجہ سے اہل فتویٰ کو اس ذکر کی ہیئت مخصوصہ سے روکنے کی ضرورت ہوتی ورنہ یہ مسئلہ فی نفسہا اختلافی ہونے کے لائق نہ تھا مگر اہل فتویٰ کو روکنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ دفع مضرت جلب نفع . . . سے مقدم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت حاصل ہے اس لئے اس کی تبلیغ وجوب کے درجے میں نہیں ہے، صرف مستحب اور احب المستحبات ہے۔ اور منکرات سے بچنا واجب ہے تو اس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنا اسی وقت مستحب ہو سکتا ہے جبکہ منکرات سے خالی ہو۔

صوفیاء اور علماء کے ذوق کا فرق

اب اس میں صوفیہ کی اور علماء کی رائے مختلف ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ فعل مستحب کو کسی حال میں ترک نہ کیا جائے اور منکرات کی اصلاح کی جائے۔ اور علماء کہتے ہیں کہ بعض احوال میں منکرات کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ خود بھی اس کو ترک نہ کیا جائے۔ اسلئے شیوع منکرات کے وقت وہ اس مستحب ہی کے ترک کا امر کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ منکرات کا انضمام ہوا ہے۔ اور اس بارہ میں رائے علماء کی مانی جاوے گی کیونکہ صوفیہ تو اہل شوق ہیں۔ ان کو دوسروں کے انتظام کی پرواہ نہیں۔ یعنی جو صوفیہ کہ محض صوفی ہوں عالم محقق نہ ہوں اور علماء منتظم ہوتے ہیں اور منتظم کی رائے غیر منتظم سے مقدم ہوتی ہے۔

صوفیاء اور علماء کی رائے کا فرق ایک مثال سے

دونوں کی حالت کا فرق ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً موسم وبا میں اطباء کا اس پر اتفاق ہو گیا ہے کہ آج کل امرود کھانا زیادہ مضر ہے۔ اس کے بعد ایک طبیب نے تو یہ کیا کہ امرود کھانا نہیں چھوڑا بلکہ قلیل مقدار میں مصلحات کے ساتھ کھاتا رہا۔ اور ایک طبیب وہ ہے جس نے خود بھی امرود کھانا چھوڑ دیا اس خیال سے کہ میں قلیل مقدار میں یا مصلحات کے ساتھ کھاؤنگا تو مجھے کھاتا ہوا دیکھ کر دوسرے بھی کھائیں گے اور وہ ان امور کی رعایت نہ کریں گے جن کی میں رعایت کرتا ہوں بلکہ اندھا دھند کھائیں گے اور ہلاک ہوں گے اسلئے وہ بالکل ہی امرود کھانا چھوڑ دیتا ہے دوسروں کو بھی علی الاطلاق منع کرتا ہے۔ بلکہ ٹوکرے کے ٹوکرے پھنکوا دیتا ہے اور دبوا دیتا ہے جس کی اس حالت کو دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو امرود سے رغبت نہیں۔ اور جو طبیب امرود کھا رہے ہیں

ان کو امرود سے بہت رغبت ہے ۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ رغبت تو اس کو ان کے برابر یا ان سے بھی زیادہ ہے مگر محض دوسروں کی رعایت سے ترک کر رہا ہے بتلائیے ان دونوں میں سے کونسا طبیب لائق اتباع ہے ۔ یقیناً یہ دوسرا طبیب زیادہ قابل اقتدار ہے ۔ کیونکہ اس کی رائے انتظام پر مبنی ہے سب اسی کی رائے کو ترجیح دیں گے ۔ بس یہی حال علماء و صوفیہ کا ہے ۔ صوفیہ اپنے غلبۂ شوق کا ضبط نہیں کرتے بلکہ مستحب کو برابر کرتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اصلاح منکرات کا قصد کرتے ہیں اور علماء بشرطیکہ خشک نہ ہوں، انتظام کی وجہ سے اپنے شوق کو ضبط کر لیتے اور ظاہر میں اس مستحب ہی کو ترک کر دیتے ہیں ۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عوام بدون ترک مستحب کے منکرات کو ترک نہیں کر سکتے ۔

صاحبو ! کیا ہمارے دل میں یہ دیکھ کر گدگدی نہیں اٹھتی کہ ہر طرف مجلس مولد ہو رہی ہے ۔ مگر محض انتظام عوام کی وجہ سے ہم اپنے شوق کو دبائے بیٹھے رہتے ہیں ۔ (النور النور صـ۵)

حبِ رسول کا درجہ

اس پر لوگ ہم کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ لوگ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہیں ۔ استغفر اللہ ۔ ارے ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم و حبِّ رسولؐ تو ہمارے یہاں عین ایمان ہے ۔ پھر بھلا عین ایمان سے بھی کوئی مسلمان منع کر سکتا ہے ۔ بلکہ دراصل ہمارے علماء ان منکرات سے روکتے ہیں جو اس ذکر کے ساتھ عوام نے منظم کر رکھی ہیں مگر چونکہ ان منکرات کی اصلاح اس ذکر کو باقی رکھ کر نہیں ہو سکتی ۔ اور یہ ذکر خاص ایام میں واجب نہیں ۔ اسلئے وہ منکرات کی اصلاح کے لئے قیود کے ساتھ ذکر ہی سے منع کرتے ہیں چنانچہ منجملہ ان منکرات کے ایک قیام بھی ہے جس میں عوام کے اعتقادات حدودِ شرع سے متجاوز ہیں ۔ اس میں بھی بعض لوگ ہمارے علماء کو بدنام کرتے ہیں کہ قیام تو ذکر رسول کی تعظیم کے لئے ہے ۔ اور یہ مولوی حضورؐ کی تعظیم سے منع کرتے ہیں ۔ اس کا جواب ایک مولوی صاحب نے خوب دیا کہ ہم ذکر رسولؐ کی تعظیم سے نہیں روکتے بلکہ ذکر اللہ کی بے تعظیمی سے روکتے ہیں کیونکہ تم لوگ ذکر اللہ کے وقت قیام نہیں کرتے، پس اگر سارا ذکر مولد قیام ہی سے کرو اور سامعین بھی سارا ذکر کھڑے ہو کر سنیں ۔ تو ہم اس قیام سے کبھی منع نہ کریں گے اور مزا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات مولویوں ہی پر کئے جاتے ہیں صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا حالانکہ بعض دفعہ وہ مولویوں سے بھی زیادہ وحشت ناک حکم دے ہیں ۔

واقعۂ خواجہ باقی باللہ

چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک شخص کی زبان سے جہر کے ساتھ لفظ اللہ نکل گیا ۔ چونکہ وہ نقشبندی تھے جن کے یہاں ضبط احوال کی تاکید ہے یہاں تک کہ ذکر بھی خفی بتلاتے ہیں جہری نہیں تبلاتے ۔ اسلئے

آپ نے فرمایا کہ نکال دو اس کو ۔ ظاہر میں یہ حکم بہت وحشتناک تھا کہ اللہ کے کہنے پر مجلس سے نکال دیا اگر کوئی مولوی ایسا کرتا تو اسی وقت کفر کا فتویٰ دیا جاتا کہ ذکر اللہ سے منع کرتے ہیں ۔ مگر صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا ۔ یہاں بڑی جلدی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ ذکر اللہ پر نہیں نکالا بلکہ عدم ضبط پر نکالا ۔ اتنا ضبط بھی نہ ہو سکا اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو قرائن سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس کو ضبط کی طاقت تھی باوجود طاقت ضبط کے پھر ضبط نہیں کیا ۔ اور اگر واقعی حد ضبط سے نکل جاتا تو پھر ملامت نہ فرماتے ۔ اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

دمادم شراب الم درکشند	وگر تلخ بینند دم درکشند
بہ تسلیم سر در گریباں برند	چو طاقت نماند گریباں درند

اسی طرح مولوی بھی قیام تعظیمی کو منع نہیں کرتے بلکہ قیام بے تعظیمی سے روکتے ہیں، جس میں احکام شریعت کی مخالفت کی جاتی اور شریعت میں ایک جدت تراشی جاتی ہے لیکن وہ غریب دنیا میں بدنام ہیں ۔ ان کے اقوال کی حقیقت سمجھنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا ۔ مگر مولویوں کو شریعت کی حفاظت کے سامنے اپنی بدنامی کی بھی پرواہ نہیں چاہیئے کوئی کچھ کہے ان کی بلا سے ۔ ایک غازیپوری مولوی اٹاوہ میں مجھ سے کہنے لگے کہ جماعت دیوبند کے تقویٰ اور تقدس کی تمام دنیا معتقد ہے صرف ایک بات لوگوں کو کھٹکتی ہے کہ آپ حضرات قیام نہیں کرتے اگر آپ قیام کرنے لگیں تو تمام دنیا آپ کی غلام ہو جائے ۔ میں نے کہا کہ وہ ہمارے آقا بن جائیں لیکن مکھی بال تو ہم قصداً نہیں کھا سکتے ۔ اب چاہے دنیا معتقد ہو یا بے اعتقاد ہو ۔ (ایضا صـ۵۲)

۲۵ - نماز پنجگانہ یا فجر و عصر کے بعد مل کر بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے ۔

ہر نماز کے بعد یا فجر و عصر کے بعد سارے نمازی مل کر جہراً لا الہ الا اللہ کہتے ہیں اور اس کا سختی کے ساتھ التزام کرتے ہیں حالانکہ سب کے واسطے بزرگوں نے نہیں کہا تھا بلکہ خاص لوگوں کو تبلایا تھا مگر جاہلوں نے اس کو حکم عام ہی بنا لیا اور التزام کر لیا ۔ اسی واسطے علماء نے اس کو بدعت کہا ۔ اب ان پر آوازے کسے جاتے ہیں کہ لو بھائی ذکر اللہ بھی بدعت ہو گیا ۔ ہائے علماء کی بھی مصیبت

ہے۔ ان سے بھی کوئی جماعت خوش نہیں۔ مگر محققین صوفیہ ان سے خوش ہیں وہ ان کی قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے محقق صوفی ہیں فرماتے ہیں کہ شرع صوفیہ دقیق ہے جو عوام کی فہم سے بالا ہے اس لئے عوام کو بھی لازم ہے کہ علوم میں صوفیہ کا اتباع نہ کریں بلکہ علماء اور جمہور کا اتباع کریں کیونکہ یہ لوگ منتظم ہیں۔

علماء کی مثال

نظام شریعت بلکہ عالم علماء ہی کے اتباع سے قائم رہ سکتا ہے۔ ہمارے ماموں صاحب کہتے تھے کہ اگر علماء دنیا میں نہ ہوتے تو ہم تو سب لوگوں کو کافر ہی بنا دیتے۔ کیونکہ ہماری باتیں عوام کی فہم سے خارج ہیں نہ معلوم وہ کیا سے کیا سمجھتے اور ایمان کو برباد کر دیتے۔ مولویوں کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے مخلوق کا ایمان سنبھال رکھا ہے تو اے وہ صوفی جو مولویوں سے ناخوش ہے اور ان پر آوازے کسا کرتے ہیں تو اس کا احسان مان کہ تو انہی کی بدولت چین سے بیٹھا ہوا اللہ اللہ کر رہا اور گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوا ہے۔ منتظم پولیس کی قدر جب ہی ہوتی ہے جبکہ رات کو راحت سے پڑ کر سوتے ہوا پس یہ علماء منتظم پولیس ہیں کہ مخلوق کے ایمان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ اپنا کام چھوڑ دیں تو پھر صوفی صاحب کو حجرہ سے نکل کر یہ کام کرنا پڑتا اور سارا تصوف اور حال وقال رکھا رہ جاتا۔ کیونکہ اصلاح خلق کا کام فرض کفایہ ہے۔ اگر مولوی اس کو چھوڑ دیں تو پھر صوفیوں پر ملا بننا فرض ہو جائے گا۔ پس تیری گٹھڑی کی خیر اسی وقت تک ہے جب تک کہ یہ منتظم جماعت دنیا میں موجود ہے تم تورات کو پڑ کر آرام کرتے ہو۔ اور آنکھ کھل گئی تو نماز اور ذکر میں مشغول ہو جاتے ہو۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا حال

اور مولویوں کی یہ حالت ہے کہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ رات کو حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مہمانوں کے پیر دبایا کرتے تھے اور کوئی پوچھتا کون ہے تو فرما دیتے کہ میں ہوں سید صاحب کا نوکر، یہ سن کر مہمان خاموش ہو جاتے۔ بہت عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا اسمٰعیل صاحب پیر دبانے آیا کرتے ہیں۔

شیخ الہندؒ کا واقعہ

یہ تو پہلے بزرگوں کا قصہ ہے اور میں نے اپنے استاذ مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی ایک حکایت اس سے بڑھ کر سنی ہے مجھے تو یہ حکایت سنکر پسینہ آگیا کہ حضرت نے اپنے کو کس درجہ مٹا دیا تھا۔ وہ یہ کہ حضرت کے یہاں ایک مہمان آئے جن کے ساتھ ایک کافر بھی تھا، گرمی کی دوپہر میں جب مہمان سو رہے تو مولانا دبے پاؤں تشریف لائے اور اس ہندو کے پاؤں دبانا شروع کئے، راوی کا بیان ہے کہ اس وقت میں اتفاق سے جاگ رہا تھا میں گھبرا کر پہونچا اور عرض کیا کہ حضرت آپ یہ کیا کر رہے ہیں، فرمایا یہ بے چارہ تھکا ماندہ ہے۔

اس کی تھکن اتار رہا ہوں۔ میں نے کہا حضرت پھر میں دباؤں گا آپ للہ ہٹ جائیں فرمایا نہیں تم تو خود تھکے ہوئے ہو اور مہمان بھی ہو۔ بس تم پڑے رہو۔ غرض نہ معلوم کتنی دیر تک اس کافر کے پیر دبائے اور وہ بے ہوش پڑا سوتا رہا۔ کیونکہ کافروں کی آنکھ تو مرنے ہی پر کھلے گی جب عذاب کے فرشتے نظر آئیں گے یہ تو بیداری میں بھی سوتے ہی ۔ ۔ ۔ ہیں۔ اور مولانا پر غلبہ حال تھا کہ منتہی ہو کر ایسا کام کیا۔ بھلا آج کل کسی صوفی نے بھی ایسا کیا ہے ہم نے تو کسی کو بھی نہیں سنا۔ پھر وہ کس منہ سے علماء پر آوازے کستے ہیں۔ (الرغبۃ المرغوبہ ص۳۰)

۲۶ - سجادہ نشینی محل میراث نہیں بلکہ محض رسم ہے۔

آج کل سجادہ نشینی بھی میراث ہوگئی ہے چاہے گدی پر گدھے ہی بیٹھیں اور تماشا ہے کہ کبھی تو مشائخ مریدوں کے سر پر خلافت کی پگڑی باندھتے تھے، آج کل مرید مشائخ کو خلافت کی پگڑی دیتے ہیں کہ جہاں پیر کا انتقال ہوا۔ اور مریدوں نے اس کے بیٹے کو گدی پر بیٹھا کر خلافت کی دستار دیدی بس اب وہ سب کے پیر ہو گئے۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس گدی نشینی کی رسم کو بالکل مٹا دیا۔ چنانچہ حاجی صاحب کی گدی پر کوئی نہیں ہے بلکہ ان کی گدی ایک گنگوہ میں تھی ایک دیوبند میں تھی (یعنی مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اور ایک کہیں، ایک کہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں زیادہ شان ہے کہ ایک شخص کی گدیاں جابجا ہوں۔ یہ کچھ نہیں کہ ایک ہی گدی ہو۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ چیز یں میراث کا محل نہیں۔

حکیم الامۃ کا ایک واقعہ

مجھ سے میرے قصبہ والوں نے ایک بار جمعہ کی مستقل امامت قبول کرنے کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہا تھا تو میں نے چند شرطوں کے بعد قبول کیا تھا۔ ایک یہ کہ امامت ۔ ۔ ۔ ۔ میرا حق نہ ہوگی دوسرے میں پابند نہ ہوں گا۔ جب چاہوں گا چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد میں نے اعلان کر دیا کہ میں لوگوں کے اصرار سے امامت کرتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ یہ میرا حق نہ ہوگا۔ نہ اس میں وراثت چلے گی۔ جس وقت کسی ایک شخص کو بھی میری امامت ناگوار ہو۔ چاہے وہ جولاہا یا قصائی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ڈاک میں ایک کارڈ پرا تنا لکھ کر میرے نام ڈالدے کہ ہم کو تیری امامت ناگوار ہے بس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک جولاہا بھی منع کر دے گا تو میں اسی روز سے امامت چھوڑ دوں گا یہ انتظام کر کے پھر میں نے امامت کی کیونکہ اب وراثت کا خطرہ نہ رہا تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے خود ہی چھوڑ دی۔

گدی نشینی

غرض آجکل امامت کی طرح گدی نشینی بھی میراث ہوگئی ہے اور بعض لوگ ایسی گدی کی تعظیم کرتے ہیں۔ بس یوں سمجھتے ہیں کہ اسی میں سب کچھ ہے یہ سب رسم پرستی ہے۔ ان لوگوں میں ایک اور رسم دیکھی گئی کہ گدی نشینی کے بعد خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے۔ میں بھاگلپور گیا تو ایک سجادہ نشین کے بابت سنا کہ وہ چالیس سال سے خانقاہ سے علیحدہ نہیں ہوئے اور ان کے مرید اس بات کو فخر کے طور پر بیان کرتے تھے۔ میں نے کہا کیا وہ مستورات ہیں، مرد تو وہ ہے جو شمشیر برہنہ لئے پھرے، ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا مردانگی نہیں، البتہ کوئی معذور ہو یا کوئی ضروری مصلحت مقتضی ہو تو اور بات ہے۔ پھر اس التزام کے بعد اگر سجادہ نشین صاحب کی کبھی کسی عدالت میں طلبی ہوگئی تو اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی طرح سجادہ صاحب کو حاضری عدالت سے مستثنیٰ کرایا جائے۔ کیونکہ آجکل کے مشائخ عدالت کی حاضری کو بھی عیب سمجھتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں عیب یا ذلت کی کیا بات ہے۔

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ

کانپور میں ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ کسی طرح طے ہی نہ ہوتا تھا۔ حاکم نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ تم کسی کو حَکَم بنا کر فیصلہ کرالو، پھر اس فیصلہ کو عدالت کی طرف سے نافذ کردیا جائے گا۔ فریقین حکم بنانے پر راضی ہوگئے۔ اس کے بعد عدالت کی طرف سے کئی علماء کا نام لیا گیا مگر کسی پر دونوں فریق کا اتفاق نہ ہوا پھر میرا نام لیا گیا تو دونوں راضی ہوگئے۔ بالآخر میرے نام سمن آیا اور مجھے شہادت کے لئے عدالت میں بلایا گیا تو اس وقت بعض دوستوں کا یہ خیال تھا کہ عدالت میں جانا ذلت ہے۔ میں نے کہا اس میں ذلت کی کیا بات ہے بلکہ یہ تو عزت کی بات ہے کہ ہماری شہادت پر ایک مقدمہ کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ میں گیا اور میرا بیان ہوا۔ اور میری . . . . . شہادت پر اٹھارہ سال کا مقدمہ طے ہوگیا۔ اسی طرح ایک دفعہ میں بریلی گیا تو وہاں کے جنٹ نے مجھ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا کیونکہ ان کو اہل علم سے ملنے کا شوق تھا۔ اس وقت بھی بعض دوستوں کی یہ رائے تھی کہ جنٹ صاحب مکان پر آئیں، اس میں عزت ہے اور خود جانے میں ذلت ہے مگر میں نے سوچا کہ اگر وہ یہاں آیا تو ہم کو اس کی تعظیم و استقبال کرنا پڑیگا اور اگر میں جاؤں گا تو وہ میری تعظیم و استقبال کریگا پھر میں خود گیا اور جنٹ نے نہایت عزت سے تعظیم و استقبال کیا۔ یہ جواب تو دوستوں کے مذاق پر تھا ورنہ اصل بات یہ ہے کہ خدا نے ان کو حکومت دی ہے ہمارے اوپر حاکم بنایا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ حاکم کو محکوم بناؤں اور اس کو اپنے یہاں بلاؤں جب خدا نے ایک شخص کو ہم پر حاکم بنایا ہے تو ادب تکوین کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو محکوم کو حاکم کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ اس لئے جب کوئی حاکم مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو میں خود جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر آج کل رسم کا غلبہ ہے لوگ

اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔

ایک حکایت

اصل مضمون گدی نشینی اور قضا میں میراث ملنے کے متعلق تھا۔ ایک خرابی یہ ہے کہ ہندو ریاست میں ایک مقام پر کوئی قاضی صاحب ایک بنئے کے مقروض ہوگئے اس نے نالش کردی جہاں قاضی صاحب کی زمین قرق ہوئی۔ وہاں خطابت کی آمدنی بھی قرق ہوگئی، کیونکہ عید بقرعید کو قاضی صاحب کی آمدنی ہوتی تھی۔ راوی کہتے تھے کہ انہوں نے ایک سال دیکھا کہ سب لوگ کپڑے بدل کر عیدگاہ میں پہونچتے رہے اور امام صاحب کے منتظر ہیں تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک لالہ صاحب دھوتی باندھے آرہے ہیں۔ اس کے آتے ہی لوگوں میں شور ہوا کہ امام صاحب آگئے میں بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ یہ کیسا امام ہے۔ کیا بنیا عید کی نماز پڑھائے گا۔ اب وہ بنیا آکر سلام کرکے ممبر پر کھڑا ہوگیا اور کہا ماجو! اجازت ہے، لوگوں نے کہا جی ہاں اجازت ہے اس کے بعد اس نے کپڑا بچھا دیا اور لوگوں نے روپیہ پیسہ ڈالنا شروع کیا، جب سب دے چکے تو اس نے رقم کو جوڑا۔ اور بہی میں لکھ لیا کہ اس سال عید کو اتنی آمدنی ہوئی۔ پوٹلہ باندھ کر گردن پر رکھا اور کہا صاجو! اجازت ہے لوگوں نے کہا اجازت ہے وہ سلام کرکے اپنے گھر کو چل دیا اور اس کے بعد لوگ بھی اپنے گھر چلے گئے نہ نماز تھی نہ خطبہ۔ انہوں نے پوچھا کہ میاں کیا عید کی نماز نہ ہوگی تب لوگوں نے قصہ بیان کیا کہ امام صاحب اس بنئے کے مقروض ہیں عیدین کی آمدنی بھی اس نے قرق کرالی ہے اس لئے امام صاحب کئی سال سے نہیں آتے ہم لوگ بدستور آجاتے ہیں اور یہ بنیا آمدنی لے جاتا ہے کئی سال سے نماز نہیں ہوتی۔ یہ نتیجہ ہے امامت اور قضاء کی موروثیت کا کہ ہندو بھی اس کی آمدنی قرق کرانے لگے۔ ایک خرابی اس موروثیت میں یہ ہے کہ بزرگوں کے نام کی آمدنی رنڈی بھڑووں میں صرف ہوتی ہے ہزاروں اوقاف آجکل برباد ہو رہے ہیں کیونکہ بزرگوں کی خانقاہوں کے لئے جو آمدنی وقف تھی اس گدی نشینی کی وجہ سے ان کی اولاد ہی اس کی متولی ہوتی ہے خواہ وہ لائق ہوں یا نالائق۔ پھر تولیت سے گذر کر ملکیت کا دعویٰ ہونے لگا۔ اسی طرح ہزاروں اوقاف برباد ہوگئے۔

(اصلاح ذات البین ص۴۹)

۲۷ - عیدگاہ میں بچوں کے لانے کی ممانعت

عیدگاہ میں باوجود کسی مفسدہ کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفسدہ بچوں کے اجتماع سے ہے اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خود اس کی اصلاح فرماگئے ہیں۔ ارشاد ہے جنبوا مساجدکم صبیانکم، کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بال بچوں کو علیحدہ رکھو، لیکن ممکن ہے کہ کوئی صاحب عیدگاہ کو مسجد میں داخل نہ کریں اس لئے استدلال مذکور کو کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ مساجدکم میں دو احتمال ہیں یا تو اس کو عام لیا جاوے کہ مطلق مقام صلوٰۃ مراد ہے تب تو عیدگاہ کا اس حکم میں داخل ہونا ظاہری ہے۔ اگر اس کو عام نہ لیا جاوے تو گو ان الفاظ میں عیدگاہ داخل نہ ہوگی لیکن یہ دیکھنا چاہیئے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے سو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چونکہ بچے پاک صاف نہیں ہوتے ان کی آمد و رفت سے ایسی جگہ ملوث ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی اور اس سے نماز میں خلل پڑیگا اور یہ علت جیسے کہ مسجد میں پائی جاتی ہے عیدگاہ میں بھی پائی جاتی ہے لہٰذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا چنانچہ خود عیدگاہ کے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ولیعتزلن الحیض المصلی پس اس مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ وہ کلیہ اس وقت ہے جب کہ وہ امر مطلوب نہ ہو ورنہ مفسدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے۔ (وعظ اکمال الصوم والعید ص۶)

۲۸ - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں ایسا مبالغہ کہ جس سے دیگر انبیاء علیہم السلام کی توہین ہو جائز نہیں،

ایکمرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کی کوکھ میں انگلی چبھو دی تھی انہوں نے کہا کہ میں تو بدلہ لوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً فرمایا کہ بدلہ لے لو اور اپنی کوکھ ان کے سامنے کر دی انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا بدن تو کھلا تھا اور آپ تو کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً کرتا اٹھا دیا وہ صحابی آپؐ کے پہلوئے مبارک سے چمٹ گئے اور بوسے دینے لگے اور

عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا تو یہ مقصود تھا۔ لوگوں نے وفات نامہ میں حضرت عکاسہ کی حکایت گھڑلی ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح حکایت یہ ہے جو میں نے اس وقت بیان کی ہے۔

غلط کتابیں ہمارے اطراف میں جتنی کتابیں عورتوں میں رائج ہیں سب گھڑی ہوئی ہیں جیسے سانپین نامہ، معجزہ آل نبی، وفات نامہ، نور نامہ، معراج نامہ، علی محمد، البتہ معجزہ ہرنی صحیح ہے۔ اس کے علاوہ جتنی کتابیں قصوں کی ہیں بالخصوص جن کا میں نے نام گنوا دیا ہے سب لغو ہیں اور چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ ایک وہ مسدس ہے جس کا ٹیپ ٹاپ کا مصرعہ یہ ہے۔

ع "مری یار کیوں دیر اتنی کری"

یہ مسدس بھی نہایت لغو ہے اس کو بھی ہرگز نہ پڑھنا چاہیئے اس ظالم نے ابتداء سے انتہا تک خدائے تعالیٰ سے لڑائی کی ہے کہیں انبیاء کے نبوت کے مل جانے پر حسد ہے کہیں سلاطین کی بادشاہت پر رشک ہے اور پھر حسد کے بعد یہ شکایت ہے کہ مجھے کیوں نہیں ملا یہ کتابیں ہرگز اپنے پاس یا اپنے گھر میں رکھنے کے قابل نہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ اس کو بلا تامل آگ میں رکھ دینا چاہیئے معجزہ آل نبی جس میں یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے کو کسی سائل کو دیدیا اور اس نے بیچ ڈالا۔ بالکل ہی غلط ہے اور لغو ہے، اسی طرح حضرت عکاسہ کی حکایت جو مشہور ہے بالکل غلط ہے۔ (وعظ مضار المعصیت ص۶)

انبیاء کی شان میں گستاخی بعض مصنفین اور واعظین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت جزئی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شان میں صریح گستاخی ہوجاتی ہے۔

۱- ارشاد فرمایا کہ یہ جو بعض مصنفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت اور انبیاء پر ثابت کرنے کے لئے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر ایک فضلیت جزئی میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کریں خواہ اس کی نسبت کوئی ثبوت نصوص سے بہم پہنچ سکے یا نہ خواہ دلائل نصوص اس اثبات مدعا کے معارض ہی کیوں نہ ہوں اور خواہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تنقیص ہی ہوجاوے، پر فضیلت جزئی بھی ثابت ہوجاوے یہ کوشش پسندیدہ نہیں، کیونکہ فضیلت کلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت ہے اور کسی جزئی فضیلت کا ثابت ہونا قادح فضیلت نہیں جیسا کہ کسی صحیح البصر کی آنکھ کا کامل ہونا دلیل اس کی نہیں کہ وہ یعقوب علیہ السلام سے افضل ہو۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے حسن ظاہری کی فضیلت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وھو

قد اعطی شطر ۔ ۔ ۔ ۔ (الحق) سے ثابت ہے اب اس میں فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کرنا ایک معارضہ ہے خود ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ایہام تنقیص ہے جمال یوسفی علیہ السلام کا جو بے ادبی سے خالی نہیں ۔

حسن کی دو قسمیں

ہاں یوں کہا جاوے تو سب پہلوؤں کی رعایت ہے کہ حسن کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو دفعۃً ناظر کو متحیر کر دے مگر اس کے دقائق تامل کرنے سے متناہی ہو جائیں ۔ اور اس کا لقب حسن صباحت مناسب ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر مصداق ہو اس شعر کا ؎

؎ یزید ک وجہہ حسنا   اذا ما زدتہ نظراً ۔

اور اس کا لقب حسن ملاحت بہتر ہے ، پس قسم اول میں یوسف علیہ السلام کو افضل الخلق کہا جائے ، اور قسم ثانی میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ۔ (مقالات حکمت ۱۱، دعوات عبدیت حصہ اول)

نبی کی ایسی تعریف جس سے دوسرے کی تنقیص ہو

(ب) آج کل بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر میں کتاب لکھی ہے "سیرۃ النبی" اس کا نام ہے ۔ مولوی شبلی نعمانی کی تصنیف ہے) اور آپ کو جامع اوصاف کمالات قرار دیکر اس کو آڑ بنایا ہے دوسرے انبیاء کرام کی توہین کا ۔ آپ کے تو کمالات ظاہر کئے ہیں ، اور دوسرے انبیاء پر حملہ کیا ہے ۔ ان کی تنقیص کی ہے ۔ لکھتے ہیں کہ :۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سیاست تھی ، حکومت تھی ترحم تھا ۔ باقی اور انبیاء علیہم السلام میں سے کسی میں سیاست نہ تھی کسی میں ترحم نہ تھا کسی میں یہ صفت نہ تھی کسی میں وہ صفت نہ تھی ۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو اپنے نزدیک مدح کی اور دوسرے انبیاء کی تنقیص کی ، ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی توہین کریں تو ایسی مدح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کب خوش ہو سکتے ہیں ، اپنے دعوے کی شہادت پیش کی ہے کہ دیکھو نوح علیہ السلام میں ترحم نہیں تھا ۔ ترحم کا مادہ کم تھا عیسیٰ علیہ السلام میں سیاست کا مادہ کم تھا درویشانہ زندگی تھی ۔

میرے سامنے یہ کتاب لائی گئی ۔ کاغذ اس کا نہایت عمدہ قیمتی ، خط نہایت نفیس پر رونق ، ظاہر تو اس کا ایسا اور اندر اس میں یہ خرافات بھری ہیں کہ نوح علیہ السلام میں ترحم نہ تھا عیسیٰ علیہ السلام

میں سیاست نہ تھی ، کس قدر بے ادبی کی انبیاء علیہم السلام کی شان میں ۔

ہر خوبی کا ہر وقت ظہور لازم نہیں

اے صاحبو ! یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء میں یہ مادے نہ تھے کیا مادہ کے لئے ظہور بھی لازم ہے اگر ایک شخص کی بابت معلوم ہوا کہ بڑا سخی ہے ۔ آپ اس کے پاس گئے اس وقت دیکھا کہ وہ خرچ بھی نہیں کر رہا تھا پس آپ نے حکم لگا دیا کہ یہ جھوٹ ہے کہ وہ بڑا سخی ہے اس کو یہی کہا جاویگا کہ جس وقت آپ گئے اس وقت ظہور کا موقع نہ ہو گا ظہور سخاوت کے موقع پر جا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ کتنا بڑا سخی ہے ، ایسے انبیاء علیہم السلام میں سب کمالات موجود ہوتے ہیں مگر وہ خدائے تعالیٰ جس کے ظہور کا حکم فرماتے ہیں ۔ اس کا ظہور ہوتا ہے ۔

نوح علیہ السلام تو ایسے رحیم تھے کہ نو سو پچاس برس تک قوم کے ہاتھ سے مصائب اٹھاتے رہے مگر بد دعا نہیں کی اس سے زیادہ اور کیا ترحم ہو گا ؟ کیا نظیر ہو سکتی ہے اس ترحم کی ، پھر اس وقت بد دعا فرمائی جبکہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آ گیا ۔ اِنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ تمہاری قوم میں سے اب کوئی اور ایمان نہیں لائے گا ، معلوم ہوا کہ ان میں دو نوں مشینیں تھیں ، نو سو پچاس برس تک ترحم کی مشین چلائی ۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ دوسری مشین کو بھی چلا دو اب جدھر اللہ تعالیٰ ادھر وہ ۔ دیکھو تو نوح علیہ السلام میں ترحم کیسا تھا کہ نو سو پچاس برس تک قوم کی تکالیف پر صبر کیا اور بد دعا نہیں کی ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ

ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصنف صاحب کے تختہ مشق ہیں ، کہتے ہیں کہ بس وہ تو فقیر اور صوفی تھے ۔ ان میں تمدن اور سیاست کہاں تھی ان کی تو یہ تعلیم تھی کہ اگر کلہ پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی سامنے کر دو ۔ مصنف صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ حق ادا کیا ہے ، اول تو میں کہتا ہوں کہ مصنف صاحب بدعی ہیں ان کے ذمہ دلیل ہے اور کیا دلیل اس کی کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا ۔ عدم ظہور سے عدم وجود لازم نہیں آتا ۔ دوسری حدیث سے ثابت ہے کہ اخیر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلطنت کریں گے ان کے سامنے ساری سلطنتیں مٹ جائیں گی سارے عالم کا انتظام ان کی مٹھی میں ہو گا ۔ ظاہر ہے کہ جب تک سیاست کا مادہ نہ ہو یہ باتیں ان سے کیسے ہو سکتی ہیں ، کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا ۔ حضرت یہ حالت ہو رہی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے لکھ مارتا ہے ، خوب سمجھ لیجئے کہ انبیاء علیہم السلام میں سارے کمالات ہوتے ہیں مگر جس مادے سے کام لینے کا حکم ہوتا ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں ۔ (وعظ الحیوٰۃ ص ۲۱)

جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے ۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آپ کے ساتھ غارِ ثور میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ تھے جن کی جاں نثاری کی یہ حالت تھی کہ جب حضور غارِ ثور پہنچے ہیں تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا چادر یا لنگی پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کئے۔ تاکہ کوئی موذی جانور نکل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہ دے ۔ سارے سوراخ تو بند ہو گئے مگر ایک رہ گیا۔ اس کے لئے کپڑا نہ رہا تھا اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا پیر لگا لیا کہ اگر کچھ نکلا تو میرے ہی پیر میں کاٹ لے گا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ سکے گا ۔ اس حالت میں جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو کفار کے آجانے سے پریشانی ہوئی ظاہر ہے کہ وہ پریشانی اپنی جان کے خوف سے نہ تھی بلکہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے پریشانی ہوئی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ دشمن آپ کو دیکھ پائیں اور حضرت کو اذیت پہنچائیں ۔ جو شخص اتنا عاشق ہو جس نے سانپ کے بل میں اپنے پیر رکھ دیئے جس میں سانپ نے کاٹ بھی لیا تھا اس کو بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے اپنی جان کا خیال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں ان کو جو کچھ خطرہ تھا وہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کا تھا اور اس خطرہ کا منشار بھی محض یہ تھا ۔ ع

"عشق است و ہزار بدگمانی"

ورنہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دولتِ توکل سے پوری طرح مالا مال تھے ، ایسے شخص کی تسلّی کے لئے وہی کلام مناسب تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا کہ اول ان کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے "لا تحزن" فرمایا ۔ پھر معیت حق میں ان کو بھی شریک کیا اور چونکہ آپ کو حصر مقصود نہ تھا اس لئے موافق اصل وضع کے ذکر اللہ کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے برابر متوکل نہ تھے نہ ایسے جاں نثار تھے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ بالکل نہ تھا ۔ محض موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا خطرہ تھا بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس کو جزم و یقین کے ساتھ ظاہر کیا ۔ قَالَ اَصْحَابُ مُوسٰی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ جس میں اِنَّ اور جملہ اسمیہ اور لام تاکید ۔ تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے حالانکہ بار بار دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابلہ میں کس طرح

کیونکہ وہ تو بڑا صاحب تصرف ہوگا۔ اور چونکہ ان کے نزدیک صوفی کا مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ اس لئے دجال کو تو بے تکلف پیشوا بنالیں گے اور جس کا یہ عقیدہ ہے کہ جہاں شریعت نہیں وہاں کچھ نہیں اس کے نزدیک کرامات وغیرہ کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ سب سے پہلے اتباع شریعت کو دیکھے گا۔ اور چونکہ دجال کافر ہوگا اس لئے یہ شخص اس کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

صاحبو! دجال قریب ہی نکلنے والا ہے اس لئے جلد اپنے عقیدہ کی درستی کرلو! اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے الہام ہوا ہے بلکہ علامات و آثار بتلاتے ہیں کہ دجال کا زمانہ خروج قریب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود یہ احتمال تھا کہ کہیں میرے ہی زمانے میں نہ نکل آوے اس لئے ممکن ہے کہ ہمارے زمانے میں نکل آوے۔ اس لئے اپنے عقائد درست کرلو۔ جس کو خلاف شریعت دیکھو اس کے ہرگز معتقد نہ ہو۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔

آجکل کے پیر مریدوں کو غلام سمجھتے ہیں

غرض آجکل پیر سمجھتے ہیں کہ مرید ہماری مملوک ہیں ماں باپ اور بیوی سب سے چھڑا دیتے ہیں۔ یاد رکھو اگر پیر کہے رات کو نفلیں پڑھو۔ اور باپ کہے سو رہو تو باپ کی اطاعت مقدم ہے ہاں اگر باپ شریعت کے خلاف کوئی حکم کرے تو اس وقت باپ کی اطاعت جائز نہیں۔ شریعت کا لحاظ مقدم ہے۔ اور ماں باپ کا اتنا حق ہے کہ جریج ایک درویش تھے بنی اسرائیل میں۔ وہ جنگل میں رہتے تھے۔ پہلی شرائع میں رہبانیت کا حکم تھا۔ ہماری شریعت میں یہ مطلوب نہیں۔ اس کے متعلق آجکل کے اعتبار سے ایک موٹی بات بتلاتا ہوں کہ تنہائی سے جو غرض ہوتی ہے جنگل میں رہنے سے آجکل وہ حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ایسے شخص کو لوگ بہت ستاتے ہیں برخلاف اس کے اگر کوئی مسجد کے حجرہ میں رہے اسے کوئی نہیں پوچھتا دوسرے سب کو چھوڑ کر تنہا عبادت کرنا کمزوری کی بات ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں — کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

ہمت کی بات یہ ہے کہ سب میں ملے جلے رہو اور پھر اپنے کام میں لگے رہو۔ حدیث میں ہو۔ المومن القوی خیر من المومن الضعیف[1] اور اگر جنگل میں کوئی نہ ستاوے تو بہتر

[1] قوی مضبوط مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے

ہے کچھ مضائقہ نہیں مگر حدود شرعیہ سے تعدی کرنا حرام ہے۔ خوب کہا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا — ولیکن میفزائے بر مصطفٰی

خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

مپندار سعدی کہ راہ صفا — تواں یافت جز بر پئے مصطفٰی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرکے حاصل کرو جو حاصل کرنا ہو۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر پوری نظر نہ ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات دیکھو وہ آئینہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نما ہیں۔

حضرت جریج صوفی کا واقعہ

غرض جریج ایک عابد تھے۔ وہ ایک مرتبہ اپنی عبادت گاہ میں نماز نفل پڑھ رہے تھے کہ ان کی ماں نے آکر پکارا۔ یہ سخت پریشان ہوئے کہ جواب دوں یا نہ دوں۔ جواب دوں تو نماز جاتی ہے نہ دوں تو ماں کی خفگی کا اندیشہ۔ آخر انھوں نے جواب نہیں دیا۔ اس نے دو تین آوازیں دیں اور بددعا دے کر چلی گئی کہ اللّٰھم لا تمتہ حتیٰ تریہ وجوہ المومسات کہ اے اللہ جب تک یہ کسی زانیہ کا منہ نہ دیکھ لے اس کی موت نہ آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکایت بیان فرما کر ارشاد فرمایا۔ لوکان فقیہا لاجاب امہ، اگر فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کو ضرور جواب دیتا۔ اور یہ قول اس کا قرینہ ہے کہ نماز نفل تھی کیونکہ فرض کو بالاجماع توڑنے کی اجازت نہیں۔ البتہ اگر کسی پر مصیبت آوے مثلاً جلنے لگے یا گرنے لگے تو اس وقت اس کے بچانے کے لئے نماز فرض بھی توڑنا واجب ہے خواہ ماں ہو یا کوئی غیر ہو۔

صاحبو! آپ نے شریعت کی تعلیم کو دیکھا۔ اللہ اکبر کس قدر رحمت کا قانون ہے آپ نے اس کے حسن و جمال کو دیکھا نہیں اس لئے کچھ قدر نہیں کرتے اس کی تو یہ حالت ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

شریعت کا حسن و جمال

شریعت تو ایسی حسین و خوبصورت ہے کہ اس کی جس چیز کو دیکھو دلربا ہے جس ادا کو دیکھو دلکش ہے۔ آپ

ملاحظہ کیا کہ کس قدر ضرورت کے قوانین ہیں کہ جب کسی کو گرفتارِ مصیبت دیکھو تو نماز فرض بھی توڑ دو اور ایسے موقع پر پہونچو۔ اور نفل میں تو اگر بلا ضرورت بھی ماں باپ پکاریں تو نیت توڑ دینا چاہیئے بشرطیکہ ماں باپ کو اطلاع نہ ہو کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے مگر جریج چونکہ فقیہ نہ تھے اس لئے جواب نہ دیا اور ماں کی بد دعا لگ گئی اور یہ واقعہ ہوا کہ قریب ایک آوارہ عورت تھی۔ اس کو کسی کا حمل رہ گیا۔ کچھ لوگ جریج کے دشمن تھے انہوں نے اس سے کہدیا کہ تو جریج کا نام لے دینا کہ اس کا بچہ ہے۔ اس کمبخت نے ایسا ہی کیا لوگ اس کے عبادت خانے پر چڑھ آئے اور اس کو توڑنے لگے اور جریج کو پیٹنا چاہا۔ اس نے پوچھا کہ اس حرکت کا آخر کچھ سبب بھی ہے یا نہیں۔ کہنے لگے تو ریا کار ہے۔ عبادت خانہ بنا کر زنا کرتا ہے۔ فلاں عورت سے تو نے زنا کیا ہے اس کے بچہ پیدا ہوا ہے۔

عبادت کا اثر

یہ عبادت خانے سے اترے۔ آخر اللہ کے مقبول بندے تھے رحمت خدا کو جوش ہوا اور ان کی ایک کرامت ظاہر ہوئی۔ حضرت جریج نے اس کے لڑکے سے پوچھا کہ بتلاؤ تو کس کا ہے۔ اس نے کہا میں فلاں چرواہے کا ہوں۔ یہ قصہ حدیث میں مذکور ہے۔ اس سے ماں کا کتنا بڑا حق معلوم ہوا مگر اس پر اجماع ہے کہ اگر پیر پکارے تو نماز نفل کا توڑنا بھی جائز نہیں۔ تو پیر کا حق ماں باپ سے زیادہ نہیں۔ اور یہ اچھے پیر صاحب ہیں کہ دوسرے کے پالے پلائے پر قبضہ کر لیا۔ کیا پیری مریدی کے یہی معنیٰ ہیں۔ (وعظ عضل الجاہلیہ صہ ۵۹)

۵۹ چھوٹے بچہ کو روزہ پر مجبور کرنا درست نہیں

ایک جگہ میں نے دیکھا کہ لڑکیوں نے ایک ذراسی لڑکی کو روزہ رکھوا دیا اور وہ جب پاخانہ گئی تو ایک ساتھ گئی۔ غرض چاہے بچہ کی جان پر بن جائے مگر روزہ ضرور رہو۔ مگر بعض دفعہ یہ روزہ روضہ میں بھی لے جاتا ہے۔ ایکمرتبہ ایک رئیس زادہ سے روزہ رکھوایا گیا گرمی کے دن تھے۔ دوپہر تک تو بیچارہ نے بنا دیا۔ مگر عصر کے وقت پیاس سے سخت پریشان ہوا۔ رئیس نے روزہ کشائی کا بہت اہتمام کیا تھا۔ تمام خاندان کی اور دوستوں کی دعوت کی تھی۔ آخر بہلایا کہ تھوڑی دیر اور صبر کرو مگر اس بے چارہ کو تاب کہاں تھی اول تو اس نے لوگوں کی

منتیں خوشامدیں کیں مگر کسی ظالم نے اس کی جان پر رحم نہ کیا۔ اور کسی نے ایک گھونٹ بھی پانی نہ دیا۔ آخر وہ خود اٹھا۔ رئیس نے اتنا سامان کیا تھا کہ مٹکوں میں برف بھری گئی تھی وہ مٹکے سے لپٹا کہ کچھ تو پانی سے قرب ہو۔ اور لپٹتے ہی جان نکل گئی۔ اس کا وبال بے رحم ماں باپ پر ہوا۔

صاحبو! شریعت کا تو یہ حکم ہے کہ اگر جوان کی بھی جان نکلنے لگے تو روزہ توڑ دینا واجب ہے۔ مگر اہل رسوم کے نزدیک معصوم بچہ کو بھی اجازت نہیں۔ افسوس! خدا کو ایسے روزہ کی ضرورت نہیں خدا تو تم سے زیادہ تم پر رحمت کرنے والا ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تم سے زیادہ شفقت ہے۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ تو جب مکلف کو یہ حکم ہے کہ ایسے وقت روزہ دے تو چار پانچ برس کا بچہ کس شمار میں ہے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ شریعت میں اتنی شفقت و سہولت ہے کہ تم بھی اپنے ساتھ اتنی نہیں کر سکتے۔

(عضل الجاہلیۃ صہ ۵۱)

۶۰ فرشتہ کو پیغمبر بنا کر کیوں نہ بھیجا گیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشریت کا اعلیٰ اور ارفع نمونہ ہیں

(۱) لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الآیۃ)

جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپؐ کی ذاتِ مبارک میں ایک اچھا نمونہ دیا ہے۔ نمونہ دینے سے کیا غرض ہوئی ہے۔ یہی کہ اس کے موافق دوسری چیز تیار ہو۔ میں نے ایک بزرگ محقق کا اس کے متعلق ایک لطیف مضمون سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے درزی کو ایک اچکن سینے کو دی اور نمونہ کے لئے ایک سلی ہوئی اچکن بھی دی کہ اس ناپ اور نمونہ کی اچکن سی لاؤ۔ درزی نے ساری اچکن نمونہ کے موافق تیار کی۔ غرض طول بھی برابر سلائی یکساں۔ غرض کہیں قصور نہیں کیا۔ فرق کیا تو صرف یہ کیا کہ ایک آستین ایک بالشت چھوٹی بنا دی۔ جب وہ اچکن لیکر مالک کے پاس پہونچے گا۔ تو مالک اسے کیا کہے گا۔ وہ اچکن خوش ہو کر لے گا یا اس کے سر سے ماریگا

اگر درزی جواب میں یہ کہے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے صرف ایک آستین میں ذرا سی کمی ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ مالک اس کو پسند کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ اس سارے کپڑے کی قیمت رکھوائے گا۔

احکام میں نبی کریم ؐ کے عمل کی موافقت ضروری ہے

خوب یاد رکھو کہ حق تعالیٰ نے احکام نازل کئے جو بالکل مکمل قانون ہیں اور ان کا عملی نمونہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا۔ سو اگر آپ کے اعمال نمونہ کے موافق ہیں تو صحیح ہیں ورنہ غلط ہیں۔ اگر نماز آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے موافق ہے تو نماز ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اگر ذکر آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے موافق ہے تو ذکر ہے ورنہ الٹی معصیت ہے۔ دیکھئے نماز میں بجائے دو کے ایک سجدہ کرلے تو وہ نماز نہ رہی دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔ کوئی قرآن شریف بحالت جنابت پڑھے تو بجائے ثواب کے الٹا گناہ ہوتا ہے۔ اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ اسمائے الٰہی توقیفی ہیں اپنی طرف سے کوئی نام رکھنا جائز نہیں۔ اگر آپ روزہ رکھیں تو وہی روزہ صحیح ہوگا۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو۔ علیٰ ہذا حج وہی صحیح ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے موافق ہو اگر حج میں کوئی احرام نہ باندھے تو وہ حج حج نہیں اسی طرح زکوٰۃ وہی صحیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ہو اور کوئی سارا مال خلاف تعلیم خرچ کر دے تو زکوٰۃ سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ یہ ارکانِ اسلام ظاہری ہوئے۔ اسی طرح اعمال باطنی کو سمجھ لیجئے اور معاملات اور طرز معاشرت سب میں یہی حکم ہے۔

فرشتے رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجے گئے

حق تعالیٰ نے ہمارے پاس کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہیں بھیجا۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ اگر فرشتہ آتا تو وہ ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس کو نہ کھانے کی ضرورت ہوتی نہ پہننے کی نہ ازدواج کی نہ معاشرت کی۔ ان چیزوں کے احکام میں صرف یہ کرتا کہ ہم کو پڑھ کر سنا دیتا یہ کام صرف کتاب کے بھیج دینے سے بھی نکل سکتا تھا۔ کہ ایک کتاب ہمارے اوپر اتر آتی۔ اس میں سب احکام لکھے ہوتے اس کو ہم آپ پڑھ لیتے اور عمل کر لیتے۔ فرشتے کے اترنے سے اس سے زیادہ کوئی بات نہ پیدا ہوتی جو کتاب سے ہو سکتی تھی۔ حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہماری جنس میں سے پیغمبر

بنائے کہ وہ ہماری طرح کھاتے پیتے بھی ہیں۔ ازدواج اور تعلقات بھی رکھتے ہیں تمدن اور معاشرت کے بھی خوگر ہیں اور ان کے ساتھ کتابیں بھی بھیجیں تاکہ کتاب میں احکام ہوں۔ اور وہ خود بہ نفس نفیس ان کی تعمیل کر کے دکھلا دیں تاکہ ہم کو سہولت ہو۔ اسی واسطے فرمایا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ یعنی ہم نے جس قدر تیرے سے پہلے پیغمبر بھیجے وہ اور آدمیوں کی طرح کھانے پینے والے اور معاشرت رکھنے والے بھیجے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا۔ یعنی اگر ہم فرشتے کو احکام لیکر بھیجتے۔ تب بھی یہ ہوتا کہ وہ انسان کی صورت میں آتا۔ ورنہ انسان کو اس سے ہدایت نہ ہو سکتی کیونکہ وہ نمونہ نہ بن سکتا۔

سید المرسلین ؐ کا انتخاب

حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات فرشتوں سے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن حکمت الٰہی اس کی مقتضی ہوئی کہ آپ نسل انسانی سے پیدا ہوں تاکہ تمام افعال انسانی میں نمونہ بن سکیں۔ دیکھ لیجئے کہ جتنی باتیں انسان کو پیش آتی ہیں سب آپ کو پیش آئیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیبیاں رکھیں، اپنی اولاد کا نکاح کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں غمی کی تقریبیں بھی ہوئیں کئی صاحبزادیوں نے انتقال کیا۔ جو حالات ہم کو پیش آتے ہیں وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں نکلے تاکہ ہمارے لئے پورا ایک دستور العمل بن جائے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ کون سا فعل ہمارا نمونہ کے موافق ہے۔ کوئی تقریب خوشی کی ہوتی ہے تو ہم نہیں دیکھتے اور کوئی تقریب غمی کی ہوتی ہے تب ہم نہیں دیکھتے کہ دستور العمل میں کیا ہے اس درزی کی مثال کو یاد رکھئے کہ ایک بالشت کپڑا کم کر دینے سے اچکن منہ پر ماردی جاتی ہے اور اگر وہ بجائے سینے کے کپڑے کی دھجیاں کر کے مالک کے سامنے جا رکھے تو وہ کس سزا کا مستوجب ہے جبکہ مالک قادر بھی ہو۔ واللہ باللہ ہمارے اعمال کی حالت یہی ہو گئی ہے کہ جو طریقہ ان کا تبلایا گیا تھا وہ تو کوسوں دور ان اعمال کو تباہ کر کے اور دھجیاں اڑا کے ہم حق تعالیٰ کے سامنے رکھ دیتے ہیں یہ کچھ مبالغہ آمیز الفاظ نہیں ہیں دیکھ لیجئے کہ جیسے اچکن سینے کے واسطے کپڑے کا اپنی اصل پر رہنا شرط ہے اور دھجیاں کرنے والا اس کو اس اصل سے نکال دیتا ہے کہ جس سے اچکن تو کیسی، کپڑے کی کوئی غرض بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح تمام اعمال کے صحیح ہونے کے واسطے ایمان کا ہونا شرط ہے کوئی چاہے کہ ایمان کھو کر کوئی عمل کرے تو وہ ایسے ہی بیکار ہوگا۔ جیسے

کوئی کپڑے کی دھجیاں کر کے اچکن سینا چاہے (وعظ منازعۃ الھویٰ صـ ۶۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

(ب) یہ بڑی غلطی ہے کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں اور آپ کے حالات کو اپنے حالات پر، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے۔ بشر لا کالبشر ولکن کالیاقوت بین الحجر۔ آپ بشر تو ہیں مگر اور انسانوں کے مانند نہیں ہیں بلکہ آپ انسانوں میں ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یاقوت ہوا کرتا ہے کہ جنس کے اعتبار سے تو وہ بھی پتھر ہی ہے مگر زمین و آسمان کا فرق ہے یاقوت میں اور دوسرے پتھروں میں۔ اب اگر کوئی محض اشتراک جنس کی وجہ سے یاقوت کو اور پتھروں پر قیاس کرنے لگے تو اس سے یوں ہی کہا جائے گا کہ عقل پر پڑیں پتھر۔ لہذا محض انسان سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس نہ کیا کرو۔ کیا انسان سارے یکساں ہی ہوا کرتے ہیں دیکھو ایک آدمی تو حبشی کالا بھجنگا ہے آدمی تو وہ بھی ہے اور ایک حسین یوسفِ ثانی ہے وہ بھی آدمی ہی ہے مگر کیا دونوں برابر ہیں اور کیا ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جا سکتا ہے ہرگز نہیں ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ اگر کسی نے آدمیوں میں صرف اس یوسفِ ثانی کو دیکھا ہو اس کے بعد پھر حبشی کو دیکھے تو وہ ہرگز یقین نہ کرے گا کہ یہ بھی آدمی ہے بلکہ اس کو جن یا دیو سمجھے گا کیونکہ اس کے نزدیک تو آدمی اسے کہتے ہیں جو اس حسین کے مشابہ ہو۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے انسان ہیں کہ آپ کو دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم تم بھی آدمی ہیں وہ تو نہ معلوم ہم کو کیا سمجھے گا کہ یہ گدھے ہیں یا بیل ہیں اب یہاں تین فرقے ہو گئے بعض تو وہ ہوئے جنھوں نے حضورؐ کو بشر ہی نہ سمجھا۔ وہ تو خواص الوہیت کو حضورؐ کے لئے ثابت کرنے لگے اور بعض وہ ہیں جنھوں نے آپ کو بالکل ہی اپنا جیسا بشر سمجھا یہ دونوں غلطی پر ہیں اور ایک فرقہ متوسط ہے جو حضورؐ کو بشر تو سمجھتا ہے۔ مگر سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھتا ہے۔ اور وہی بات کہتا ہے۔ بشر[1] لا کالبشر بل کالیاقوت بین الحجر۔ واقعی سچی بات ہے ؎

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر ... ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمے ... درمیاں فرقے بودے منتہا۔

(وعظ ابوار الیتامیٰ صـ ۲۶)

---

[1] بشر ہیں مگر عام بشر کی طرح نہیں بلکہ جیسے پتھروں میں یاقوت ہوتا ہے۔

۶۱ بعض جدید تعلیم یافتوں کا حال اُن سے مُسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

افسوس ہے کہ آج کل جن لڑکوں کو بیٹیاں دی جاتی ہیں بعضے ان میں سے جدید تعلیم کے اثر سے ایسے آزاد منش ہوتے ہیں کہ ان کو دین ایمان سے بھی کچھ علاقہ نہیں رہا۔ زبان سے کلمات کفر بک جاتے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ پھر انہیں میں سے ایک سے مسلمان لڑکی کا نکاح پڑھوایا جاتا ہے اور سب گھر والے خوش ہوتے ہیں کہ ایک مسنون طریقہ ادا کیا جاتا ہے اس سنت کی صحبت کے لئے موقوف علیہ ایمان۔ افسوس ہے کہ نوشہ صاحب نہ جانے کتنی دفعہ اس سے خارج ہو چکے ہیں اب وہ مثال صادق آتی ہے یا نہیں کہ کپڑے کے پرزے پرزے کر کے بلکہ جلا کے اچکن سینے کا ارادہ کیا جاتا ہے ہم کو تو اسی کا رونا تھا کہ اچکن نمونہ کے موافق نہیں سی جاتی۔ ایک آستین بالشت بھر کم کی جاتی ہے یہاں نہ آستین رہی نہ دامن اور خیال یہ ہے کہ اچکن تیار رہے۔ ایک نیک بخت لڑکی ایک انگریزی خواں سے بیاہی گئی جو ایک مجمع میں یہ لفظ کہہ رہے تھے کہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی بہت بڑے ریفارمر تھے اور مجھ کو آپ سے بہت تعلق ہے لیکن رسالت میں ایک مذہبی خیال ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ یہ کلمہ کفر ہے نکاح اس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اگر لڑکی والوں کو بتلایا جاتا ہے تو الٹے لڑنے کو سیدھے ہوتے ہیں کہ ہمارے خاندان کی ناک کٹواتے ہیں۔ اب وہ زمانہ ہے کہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ دیکھ لیا جاوے کہ داماد مسلمان ہے یا کافر بجائے اس کے پہلے دیکھا جاتا تھا نیکوکار ہے یا بدکار۔ اس قصہ سے میرے قول کی تصدیق ہو گئی کہ ہمارے اعمال خراب ہی نہیں بلکہ باطل ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہم ان کو اچھے سمجھ کر اجر کے امیدوار بیٹھے ہیں ؎

وسوف تریٰ اذا انکشف الغبار ... افرس تحت رجلک ام حمار

(غبار چھٹ جانے کے بعد ظاہر ہوگا کہ تم گھوڑے پر ہو یا گدھے پر۔)

(وعظ منازعۃ الھویٰ صـ ۶۵)

۶۲ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہونے کی تمنّا؟

فرمایا کہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو اچھا ہوتا میں کہتا ہوں کہ ایک اعتبار سے ہم لوگوں کا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ ہونا ہی اچھا ہوا کیونکہ ہم لوگوں کی حالت ٹھیک نہیں ہے خدا کی راہ میں مال دینا مشکل معلوم ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شب و روز امتحان درپیش تھا کبھی زکوٰۃ کا حکم ہوتا تھا کبھی جہاد میں جان دینے کا، عزیز و اقارب کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ سو ہماری ایسی طبیعت والے اگر احکام نبوی کے بجالانے میں کوتاہی کرتے۔ تعجب نہ تھا کہ انکار نبوت تک نوبت آجاتی۔ جس کا انجام کفر و خسران دارین تھا۔ دوسرے خدا جانے معاصرۃ کہیں اپنا رنگ نہ لاتی اور اب تو جمع کی کرائی شریعت ہم کو مل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات ہم نے سُن لئے حضور کی عظمت بھی قلب میں بلا مزاحم موجود ہے اگر خدانکردہ خلاف بھی کریں گے تو کسی خطاب جزئی کا تو خلاف نہیں ہے۔ ان لوگوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے عمر سے ہر حالت میں دیکھا۔ آپؐ ان کے معبودوں کو بُرا کہتے تھے آپ کی قرابت بھی لوگوں سے تعلقات تھے بہت سے امور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسے پیش آتے تھے جو لوگوں کے خلاف جمع ہوتے تھے لیکن پھر بھی وہ لوگ اطاعت کرتے تھے کمال ان کا تھا نہ کہ ہم لوگوں کا۔

(مقالات حکمت، دعوات عبدیت حصہ ہفتم)

۶۳ لوگوں نے غفور رحیم کے معنیٰ غلط سمجھے!

خدا غفور رحیم ہے۔ توبہ استغفار کرلیں گے گناہ معاف ہوجائیں گے مگر دنیا کا نفع یعنی مکان بنانا بغیر رشوت کے نہیں ہو سکتا اگر رشوت نہ لی تو منافع حاصل نہ ہوں گے۔ اور اس نقصان کی بظاہر کوئی تلافی نہیں معلوم ہوتی۔ پس جس نقصان کی تلافی ہوسکتی ہے اس کو گوارا کرکے رشوت لینا چاہیئے۔ پھر خدا سے معافی کرالیں گے۔ تو صاحبو! آپ نے

دیکھ لیا کہ نفس بدخواہی کو کس رنگ آمیزی کے ساتھ خیرخواہی کی صورت میں لاتا ہے۔

طوطے کی مثال

مگر شیطان کے اس سبق کی وہی مثال ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے اپنے طوطے کو لفظ دریں چہ شک سکھلا دیا تھا وہ ہر بات کے جواب میں یہی لفظ کہدیا کرتا تھا مگر یہ لفظ ایسا ہے کہ اکثر باتوں کا جواب بن بھی جاتا ہے۔ چنانچہ اس شخص نے طوطہ کو یہ لفظ یاد کرا دیا اور بر سر بازار لاکر دعوی کیا کہ میری طوطی فارسی بولتی ہے ایک شخص نے اس کا امتحان لیا کئی باتیں اس سے کیں سب کے جواب میں اس نے دریں چہ شک ہی کہا۔ مگر ان باتوں پر یہ جواب چسپاں تھا۔ اس نے خوش ہو کر اس کو خرید لیا۔ اور گھر پر لایا اب اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اس نے سب کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہا چاہے جوڑ لگے یا نہ لگے آخر اس نے جھلا کر کہا کہ افسوس میں نے تیرے خریدنے میں بڑی بیوقوفی کی اس نے اس کے جواب میں بھی کہا۔ دریں چہ شک، کہ اس میں کیا شک ہے۔ ایسے ہی ہمارے نفس کو بھی ایک سبق یاد ہے۔ ہر جگہ اس کا استعمال کرتا ہے وہ یہ کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے خواہ وہ کیسا ہی گناہ ہو حق اللہ ہو یا حق العبد۔

غفور رحیم کا حاصل

دوسرے یہ احمق نہیں جانتا کہ غفور رحیم ہونے سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ گناہ کا ضرر نہ ہوگا۔ اگر غفور رحیم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے تو جیسے خدا تعالیٰ آخرت میں غفور رحیم ہیں دنیا میں بھی تو ہیں کیونکہ صفات باری سب قدیم ہیں۔ پھر سنکھیا کھانے سے ضرر کیوں ہوتا ہے اگر غفور رحیم ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ جو کچھ چاہو کرو کچھ ضرر نہ ہوگا تو سنکھیا کھانے سے بھی کوئی نقصان نہ ہونا چاہیئے۔ مگر ضرر یقینی ہوتا ہے اور باوجود ضرر ہونے کے خدا کے غفور رحیم ہونے میں فرق نہیں آتا تو ایسے ہی آخرت میں بھی غفور رحیم ہوں گے اور گناہ کا بھی ضرر ہوگا کیونکہ غفور رحیم ہونے کے لئے ضرر نہ ہونا لازم نہیں خداوند تعالیٰ رحیم اس طرح ہیں کہ تم کو تبلا دیا کہ لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی وَلَاتَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً۔ یہ کتنے بڑے رحم کی بات ہے کہ خود بخود ایک قانون مفید تجویز فرما کر سب کو تبلا دیا کہ طریق فلاح و رضا الٰہی یہ ہے ورنہ کام تو خود ہمارے ذمہ تھا کہ رضائے مولا کا طریقہ معلوم کرتے۔ دوسرے حق تعالیٰ نے حق جہاں اپنی رضا حاصل کرنے کے طریقہ بیان فرمائے ہیں وہاں ایسے امور کی بھی تعلیم دی ہے جن سے امن عام قائم رہے اس کے سوا اور بھی رحیم ہونے کے معنیٰ ہیں جو میں آئندہ تبلاؤں گا۔ اور غفور ہونے کے یہ

بھی معنیٰ ہو سکتے ہیں کہ بعد سزا کے بخش دیں۔ اگر کہئے کہ کیسی مغفرت ہے کہ سزا بھی ہو اور بخشش بھی ان دونوں میں تو منافات ہے۔ تو صاحبو! آپ نے نہ خدا کی عظمت سمجھی نہ گناہ کی حقیقت معلوم کی تو سمجھو کہ گناہ کہتے ہیں حاکم کی سرکشی کو۔ اور جس قدر حاکم بڑا ہوتا ہے اسی قدر اس کی سرکشی بھی جرم عظیم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سرکشی تو یہ ہے کہ حاکم ضلع کا کہنا نہ ماننا۔ مگر اس سے بڑھ کر وائسرائے کا کہنا نہ ماننا اور بادشاہ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے۔ ایسے ہی بڑے بھائی کا کہنا نہ ماننا ایک جرم ہے مگر باپ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے غرض سرکشی کی شدت کا مدار اس شخص کی عظمت پر ہوتا ہے جس کی سرکشی کی گئی۔ ایک مقدمہ تو یہ سمجھ لیجئے۔ دوسرا مقدمہ سب پہلے سے مسلم ہے کہ خدا سے بڑا کوئی حاکم نہیں کیونکہ اور سب کی تو عظمت محدود ہے اور عظمت الٰہی غیر محدود، خارج از . . . وہم و قیاس ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ بھی سب کے نزدیک بدیہی اور مسلم ہے کہ سزا بقدر گناہ ہوا کرتی ہے۔

خدا کی مخالفت

بس اب سمجھئے کہ جب خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں تو اس کی مخالفت سے بڑھ کر کوئی مخالفت نہیں اور اسی کی مخالفت کی سزا سے بڑھ کر کسی کی مخالفت کی سزا نہیں ہو سکتی۔ تو جیسا عظمت غیر اللہ محدود ہے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہوتی ہے اور چونکہ عظمت الٰہی نامحدود ہے اس لئے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہونی چاہیئے پس اس عقلی قاعدہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی صغیرہ گناہ بھی ہو جائے تو چونکہ خدا کی نافرمانی ہے اس لئے اس کی سزا بھی ابدالآباد جہنم ہونی چاہیئے اور اس کے لئے کبھی مغفرت نہ ہونی چاہیئے مگر خدا تعالیٰ نے ابدالآباد جہنم سوائے مشرکین و کافرین کے کسی کے واسطے مقرر نہیں فرمائی۔ پس اگر حق تعالیٰ کسی گناہ میں دس ہزار لاکھ برس کے بعد بھی چھوڑ دیں تو یہ ان کی مغفرت اور بخشش ہے یا نہیں یقینی ہے اور ضرور ہے۔ اور دنیا کے قصوں میں ہم اس کو رات دن جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس سال کی جیل کا مستحق ہو اور حاکم اس کو دو برس کے بعد چھوڑ دے یہ اس کا انعام سمجھا جاتا ہے یا نہیں۔ پس نامحدود عذاب کے بجائے اگر حق تعالیٰ محدود عذاب دے کر دس ہزار یا دس لاکھ برس کے بعد بھی نجات عطا فرما دیں تو یہ بھی یقیناً مغفرت ہوگی۔ اب آپ کی سمجھ میں آ گیا کہ غفور ہونے کے لئے سزا نہ دینا ضروری نہیں بلکہ غفور ہونے کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایک محدود زمانہ تک سزا دے کر رہا کر دیا جائے اور غفور ہونے کی

ایک یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ گناہ کرتے ہی فوراً سزا نہ دی جائے جس کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے اور اس کی رحمت بھی کہہ سکتے ہیں اور رحیم کے دوسرے معنیٰ سنیئے۔ وہ یہ کہ عرفاً یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جس کی خطا معاف کرتے ہیں اس کے لئے یہی بڑی بات ہوتی ہے کہ جیل سے رہا کر دیا جائے اس کے لئے انعام کا کوئی قاعدہ نہیں نہ کوئی مستحق انعام و اکرام سمجھے تو حق تعالیٰ کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ جہنم سے نکال کر چھوڑ دیتے جس حال میں چاہے رہے خواہ مرے یا جیئے خواہ راحت میں رہے یا تکلیف میں مگر وہ رحیم بھی ہیں ان کی رحمت کا مقتضا یہ ہے کہ وہ جہنم سے نکال کر وہ جگہ دیتے ہیں جو جنت کے نام سے مشہور ہے جس میں وہ چیزیں ہیں کہ جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سُنا نہ کسی دل پر ان کا خطرہ گذرا۔ فیہا مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

خطا معاف کر کے مقرب بنانا

پھر یہ خطا معاف کر کے اس کو اپنا مقرب بناتے ہیں۔ کسی سے ہفتہ وار ملاقات ہوا کرے گی کسی سے ماہوار کسی سے سالانہ۔ اور سب سے مقرب وہ شخص ہوگا جس سے دن میں دو مرتبہ صبح و شام ملاقات ہوا کرے گی۔ پھر یہ نہیں کہ آنے والوں کو حکم ہو کہ خود سلام کریں بلکہ حدیث میں ہے کہ سب لوگوں کو ایک باغ میں جمع کیا جائے گا اور حق تعالیٰ ان پر متجلی ہوں گے اور پہلے خود فرمائیں گے السّلام علیکم پس اس کی نظیر کوئی پیش کر سکتا ہے کہ خطاوار اور گنہگار کے ساتھ اس قدر انعام کیا جاتا ہے تو آپ نے دیکھا کہ حق تعالیٰ کیسے کیسے انعامات فرمائیں گے کہ خود اپنے بندوں کو سلام فرمائیں گے پھر نہیں کہ ان کو بلا دیں گے بلکہ خود ان کے پاس تشریف لے جا کر متجلی ہوں گے اس کے وقت وہ حال ہوگا کہ سب زبان حال سے کہتے ہوں گے ؎

"امروز شاہ شاہاں مہمان شدت مارا"

تو دیکھئے خدا کی رحمت کے معنیٰ سمجھ میں آ گئے اب اس تفسیر کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ رحمت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہو تو یہ نفس کا بڑا دھوکہ ہے کہ حق تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے سے یہ سمجھتا ہے کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہوگی اسی کو کہتے ہیں۔ کلمة حق ارید بها الباطل"۔ اسی لئے میں کہتا تھا کہ نفس خیر خواہی کے پردے میں بدخواہی کرتا ہے۔ (وعظ وحدۃ الحب ص۵ پانچواں وعظ دعوات عبدیت حصہ ہشتم)

۶۴ جاہل واعظوں کے وعظ کی خرابیاں

غیر عالم کبھی وعظ نہ کہے۔ اس میں چند مفاسد ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیئے اور آپؐ فرماتے ہیں "اذا وصل الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ۔" کہ جب کام نااہلوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر رہو۔ گویا نااہل کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کے علامت سے ہے اور یہ امر مصرح وثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامات قیامت سے ہوں وہ معصیت اور مذموم ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں۔ یہ منصب صرف علماء کاملین کا ہے اس لئے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے۔ دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں بوجہ ناواقفیت کے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔ گو بعضے بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق احتیاط کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا۔

جاہل واعظ کی خرابیاں

علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے پھر آج کل ایسے نفس کہاں ہیں جو صاف کہدیں کہ ہم جاہل ہیں ہم کو مسائل معلوم نہیں۔ ضرور کچھ گھڑ گھڑ کر جواب دیں گے اور اکثر وہ غلط ہو گا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچا لیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑجاویں۔ بعض جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا۔ اس کا ایسا جواب دیتے ہیں جس سے نہ جواب معلوم ہو اور نہ جہل ظاہر ہووے۔

گنگوہ میں ایک جاہل فتویٰ دیا کرتا تھا۔ مولانا گنگوہی رحؒ نے اپنی نوعمری میں اس سے امتحاناً سوال کیا کہ حالت حمل میں بے شوہر عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے۔ کہا ایسا ہے جیسے گھیر دینا۔ اس گول مول جواب سے نہ اس کا جہل ظاہر ہوا نہ جواز کا فتویٰ ہوا۔ مگر ایسے جوابات سے عوام کیا سمجھیں گے یقیناً غلطی میں پڑیں گے شاید کوئی جاہل واعظ یہ کہے کہ ہم کتابیں دیکھ کر فتویٰ دیا کریں گے اور آج کل اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے تو

تو میں کہتا ہوں کہ بعض مسائل کا تعلق دو باب سے ہوتا ہے ایک باب میں تو اس میں اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے باب میں اس کا مقید ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ قیود و شرائط بعض دفعہ ایسی ہوتی ہیں جن پر جاہل تو جاہل ناقص عالم کی نظر بھی نہیں پہنچتی۔ بعض دفعہ ناتمام علم سے لوگوں کو تنگی میں ڈالے گا۔ (چنانچہ بعض غیر محقق مولوی وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ روزی پہونچانے کا خدا کا وعدہ ہے اور مسلمانوں کو بھروسہ نہیں، گھبراتے ہیں۔ یہ ان کا عام مضمون ہے اور اس پر وہ ضعیف ایمان کا حکم لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کوئی مخلوق دعوت کر دے تو اس پر پکا اعتبار ہوتا ہے اور اس وقت کے رزق سے بے فکری ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کے وعدہ پر بھروسہ نہیں۔ سو یہ غیر محقق خوب سمجھ لیں کہ یہ ضعف ایمان نہیں بلکہ ضعفِ طبیعت ہے

ضعف ایمان ضعف طبیعت

ضعف ایمان اور ہے اور ضعف طبیعت اور۔ اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو خدا کے وعدہ پر بھروسہ نہ ہو۔ اور تنویر کے لیے جو مثال بیان کی جاتی ہے وہ محض غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا قیاس مخلوق کے وعدہ پر صحیح نہیں۔ کیونکہ جو شخص وعدہ کرتا ہے وہ یہ تبلا دیتا ہے کہ فلاں وقت کی دعوت ہے جس سے پورے طور پر یہ حال معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے کھانے کا اس وقت پورا بندوبست ہو گیا۔ اگر ایسا ہی تفصیلی وعدہ اللہ تعالیٰ کا ہوتا تو مسلمانوں کو مخلوق سے زیادہ اس پر اعتماد ہوتا مگر خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ نہیں ہے کہ دونوں وقت دیں گے۔ پاؤ بھر دیں گے ناغہ نہ کریں گے۔ بلکہ مبہم وعدہ ہے کہ روزی دیں گے۔ اس کی کیفیت اور کمیت نہیں تبلائی گئی۔ ممکن ہے کہ تیسرے روز ملے غرض ابہام ہے اور اس شخص کا وعدہ ہے کہ شام کا وقت تبلا دیا ہے تو ضعف ایمان کی وجہ سے یہ تردد نہیں بلکہ اس کی کیفیت اور مقدار معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تردد ہے جس کا باعث طبعی ضعف ہے اگر داعی کا بھی ایسا ہی وعدہ ہو تو اس سے زیادہ تردد ہو جائے تو یہ کیا ظلم ہے۔ الزام لگانے والوں نے الزام لگایا ضعفِ ایمان کا۔

(وعظ شعبان ص۱۴۸، دعوات عبدیت حصہ ششم)

سونا چاندی خریدنے کا مسئلہ

مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ اتحاد جنسین کے ساتھ تفاضل ناجائز ہے۔ مثلاً

چاندی کے بدلے چاندی۔ یا سونے کے بدلے سونا خریدا جائے تو مساوات ضروری ہے۔ تفاضل کمی بیشی حرام ہے۔ اب جاہل تو اس مسئلہ کو دیکھ کر اسی طرح بیان کردے گا۔ اور ممکن ہے کہ ایک وقت چاندی کا بھاؤ روپئے کے برابر نہ ہو بلکہ چاندی دس آنہ تولہ ہو جو ایک روپئے کے مقابلہ میں روپے کے وزن سے زیادہ آئے گی اور ان حضرات کو صرف اتنا ہی مسئلہ معلوم ہو کہ اتحاد جنس کے وقت تفاضل حرام ہے۔ تو یہ حضرات یا تو خود روپئے کے برابر ہی لائیں گے پھر گھر والے ان کو بے وقوف بنائیں گے یا دوسروں کو اس پر مجبور کریں گے۔ اور دونوں صورت میں شریعت کو بدنام کریں گے کہ یہ اچھا مسئلہ ہے کہ ایک چیز روپئے میں روپئے سے زیادہ آسکتی ہے مگر شریعت کہتی ہے کہ نہیں برابر ہی تولو۔ زائد مت تولو۔ تو یہ خرابی جہل کی وجہ سے ہوئی۔ محقق اگر اس مسئلہ کو بیان کرے گا تو ساتھ ساتھ یہ بھی کہدے گا کہ اگر چاندی ایک روپئے کے بدلہ میں اس سے زیادہ آتی ہو تو اس وقت روپئے سے چاندی نہ خریدو بلکہ روپئے کو بھنا کر کچھ دونیاں چونیاں اور ان کے ساتھ کچھ پیسے ملا کر خریدو اب جائز ہے کہ ایک روپے کے بدلے میں تولہ بھر سے زیادہ چاندی لے آؤ کیونکہ ریزگاری میں جتنی مقدار چاندی ہوگی اس کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آئیگی باقی چاندی پیسوں کے مقابلے میں ہو جائے گی۔ اور پیسہ اور چاندی ہیں۔ جنس بدل گئی۔ اس میں کمی بیشی جائز ہے۔ یہ تو مثال تھی تنگی میں ڈالنے نہ ڈالنے کی۔

طلاق کا مسئلہ

اب مسئلہ اطلاق و تقیید کی مثال سنیئے۔ مثلاً باب الکنایات میں فقہا نے لفظ اختیاری کو کنایات طلاق میں بیان کیا ہے۔ اور اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وقوع طلاق نیت کے بعد ہوتا ہے تو اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختیاری میں بھی صرف نیت سے وقوع طلاق کا ہو جاوے گا۔ لیکن اس اختیاری سے وقوع طلاق کی ایک شرط اور بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ اختیاری میں نیت کے ساتھ وقوع نہیں ہوتا بلکہ عورت جب اسی مجلس میں طلاق کو اختیار کرے اس وقت وقوع ہوتا ہے اور اختیار منکوحہ کی شرط فقہاء نے باب الکنایات میں نہیں بیان کی بلکہ یہ شرط باب التفویض میں لکھی ہے پس اگر کوئی لفظ اختیاری کو صرف باب الکنایات میں دیکھ کر حکم بیان کردے گا وہ ضرور غلطی کرے گا اور نیت زوج کے بعد فوراً وقوع کا فتویٰ دیدے گا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اور اس میں بعض علماء تک بھی غلطی

کر چکے ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی نے ایک فقیہ کی غلطی نکالی ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں غلط فتویٰ دیا ہے۔

مطلق و مقید کا فرق

نیز بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ایک کتاب میں مطلق ہے دوسری کتاب میں مقید ہے اس لئے مسائل فقہ میں مفتی کو لازم ہے کہ صرف ایک کتاب کو دیکھ کر فتویٰ نہ دے بلکہ مختلف کتابوں میں دیکھ کر جواب دے۔ غرض فقہ کا فن بہت دقیق ہے۔ جاہل واعظ ضرور غلطی کرے گا۔ اور اس کے امتحان کی آسان صورت یہ ہے کہ کسی جاہل کے وعظ میں ایک عالم کو دوچار دفعہ پردہ میں بٹھلاؤ دوچار دفعہ کی اس لئے ضرورت ہے کہ ایک دفعہ تو غلطی سے محفوظ رہ جانا ممکن ہے۔ مگر ہمیشہ محفوظ رہ جانا جاہل سے دشوار ہے۔ دوچار دفعہ کے بعد ان عالم صاحب سے پوچھ لینا کہ اس نے کتنی غلطیاں کی ہیں۔ انشاء اللہ حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ کام نااہل کو نہ دینا چاہیئے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم سے غلطی نہیں ہوتی عالم بھی بشر ہے اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر وہ خفیف اور قلیل غلطی کرے گا۔ شدید اور بکثرت غلطی نہ کرے گا یعنی اس کے بیان میں شاذ ونادر کبھی سو بار میں ایک بار غلطی ہوگی اور جاہل کے وعظ میں کثرت سے غلطیاں ہوں گی پھر عالم دوسرے وقت اپنی غلطی پر متنبہ ہو سکتا ہے۔ اور دوسرے بیان میں اس کی اصلاح بھی کر سکتا ہے اور جاہل کو تنبہ بھی نہیں ہوگا کہ میں نے کیا غلطی کی ہے اس لئے یہ اس سے اشد ہے خوب سمجھ لو۔

صاحب آپ کو تجربہ نہیں اور مجھے تجربہ ہے جس کی بناء پر میں کرتا ہوں کہ نااہل کو وعظ کی اجازت نہ دینا چاہیئے۔ واللہ جہل کی وجہ سے بڑی خرابیاں ہو رہی ہیں۔ کانپور میں ایک شخص نے ایک ایسے بکرے کی قربانی کی جس کا کوئی عضو عیب سے خالی نہ تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ اس کی قربانی جائز نہیں تو وہ کہتا ہے۔ واہ ہماری بیوی صاحبہ نے فتویٰ دیا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔ پھر اس نے بیوی سے جا کر کہا کہ لوگ تمہارے فتویٰ میں غلطی نکالتے ہیں اس نے شرح وقایہ کا اردو ترجمہ پڑھا تھا اس میں مسئلہ کا موقع نکال کر باہر بھیجدیا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ تہائی عضو سے کم کٹا ہو تو قربانی جائز ہے۔ اور اس بکرے کا کوئی عضو تہائی سے زائد نہیں کٹا بلکہ کم ہی ہے۔ گو مجموعہ مل کر بہت زیادہ تھا۔ کچھ ٹھکانا ہے اس نامعقول حرکت کا کہ ایک عورت بھی شرح وقایہ کا ترجمہ پڑھ کر مفتی بن گئی

(وعظ الہدیٰ والمغفرہ صفحہ ۴۰)

۶۵ عوام کا ہر دینی کام میں دلیل تلاش کرنا بڑی غلطی ہے

فرمایا کہ ہر عمل کا مدار اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً باورچی نے کھانا سامنے لاکر رکھدیا۔ اب صرف اس کے اعتماد پر کھانا کھالیا جاتا ہے حالانکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ کہیں زہر نہ ملادیا ہو۔ چنانچہ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے۔ اب دیکھئے یہاں پر زہر ملانے کا احتمال کا خیال نہیں کیا جاتا۔ علیٰ ہذا تاجر لوگ کروڑوں روپئے کی تجارت صرف ملازمین کے اعتماد پر کرتے ہیں حالانکہ بعض اوقات ملازم لوگ بہت سامال غبن کرڈالتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہوں کا بھی سارا کام نوکر چاکر ہی کے ذریعہ چلتاہے اسی طرح دین کا بھی کل کام اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کو قرآن مجید ماننا علماء کے اعتماد پر ہے۔ اور اس زمانہ کے علماء کو اپنے سے اگلے علماء پر۔ پھر ان کو صحابہ کرام پر۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ پس ثابت ہوا کہ کل کام خواہ . . . دین کا ہو یا دنیا کا۔ سب کا دار و مدار اعتماد ہی پر ہے۔ اب عوام کو ہر امر دین میں دلیل تلاش کرنا غلطی ہے۔ (مقالات حکمت ۱ دعوات عبدیت حصہ ہشتم)

۶۶ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنّت میں جانا رحمت سے ہوگا نہ کہ عمل سے اس پر ایک شبہ کا جواب

کوئی یہ سُن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں نہ جائیں گے۔ یہ نہ سمجھ لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں کچھ نقصان تھا۔ بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہ ہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثمرہ تابع سبب کے ہوتا ہے اگر سبب ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا۔ اور اگر سبب کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناہی کا نصف بھی غیر محدود

ہی ہوگا رحمت حق کا اول تو تجزیہ نہیں ہوسکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسی نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ غیر متناہی ہوگا کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جاوے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے بمرات متناہیہ متناہی ہوتاہے بہرحال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کرچکا ہوں کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے یعنی سبب ناقص تو ثمرہ بھی ناقص۔ اور سبب کامل تو ثمرہ بھی کامل۔

سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہوگا تو متناہی ہوگا۔ کیونکہ عمل متناہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا تو غیر متناہی ہوگا کیوں کہ رحمت غیر متناہی ہے۔ اس لئے رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔ غرض آپ کا عمل محدود تو ہوگا مگر نعوذ باللہ ناقص نہیں۔ پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپؐ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اعمال ہر طرح کامل ہیں۔ مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے اس لئے آپؐ کے اعمال کو سبب نہیں بنایا گیا دخول جنت کا۔ بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہوسکتے چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا ثمرہ ہوا تو پھر بندہ کا کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔ خیال تو فرمائیے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔ خیال تو فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپ یوں فرمارہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا۔ تو پھر ہمارا کیا منہ ہے۔

(وعظ الحیٰوۃ صہ ۱۸)

۶۷:- حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسمٰعیلؑ سے بوقت ذبح رائے دریافت کرنے پر ایک شبہ کا جواب

بعض لوگ یہ سمجھے کہ رائے دریافت کرنے کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ تمہاری کیا رائے ہے تو انہوں نے کہا یَاۤ اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ کہ

اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے اور یہ سمجھ کر ان کو شبہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو نعوذ باللہ تردد تھا ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو تردد نہ تھا کہ انبیاء ع میں اس کا احتمال ہی نہیں بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہوئے ہیں کہ گو تردد نہ تھا مگر اس وقت بیٹے میں باپ سے زیادہ استقلال تھا جیسا کہ ان کے سوال مَاذَا تَرٰی میں اور ان کے جواب اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ میں موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس تفاوت کا ایک نکتہ بیان کیا جو عوام کو پسند بھی آئے گا۔ مگر ابراہیم علیہ السلام کی اس میں صریح تنقیص ہے وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ابراہیم علیہ السلام کے بدن میں تھا۔ اس کی وہ برکت تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کو کس قدر استقلال تھا کہ آگ میں ڈالے گئے اور مضطرب نہ ہوئے جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو وہ نور ان میں منتقل ہو گیا۔ اس واسطے وہ اس درجہ میں مستقل المزاج ہو گئے تھے۔ مگر اس توجیہ سے میرا رونگٹا کھڑا ہوتا ہے کیا توجیہ کی ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر کی جناب میں گستاخی کی بھی پرواہ نہ کی۔ بس ایسی توجیہ رہنے دیجئے۔ ؎

زعشق ناتمام ماجمال یار مستغنی است

بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را۔

ناتمام اس معنی کر کہ اس میں تنقیص ہے ابراہیم علیہ السلام کی۔ نور محمدی کے جدا ہونے کے بعد غیر مستقل ہو جانا محض جزاء ہے اور رجم بالغیب ہے۔ غور کرو تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی گستاخی ہے کیونکہ آپ کا نور ایسا نہیں جس کا اثر زائل ہو جاوے آگ تنور کے اندر جلائی جاتی ہے تو ایک گھنٹہ تک تنور اس کے اثر سے گرم رہتا ہے تو کیا وہ نور اتنا بھی نہ ہوگا اس کے منتقل ہونے کے بعد ابدالآباد تک اس کا اثر رہے یہ تفاوت ہی نہیں جو ان خرافات کے ماننے کی ضرورت پڑے۔ اصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اسمٰعیل علیہ السلام کے صرف پدر مشفق اور مربی شفیق ہی نہ تھے بلکہ وہ شیخ بھی تھے۔ سنو! شیخ ہونے کی حیثیت سے ان کو ان کے استقلال کا امتحان مقصود تھا۔ اس واسطے فرمایا فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی مگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے کہ فرماتے ہیں یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ اور کیا ٹھکانا ان کے عرفان کا اتنا بڑا توکل کہ اپنی قوت

پر نظر نہیں یہاں بھی کہتے ہیں "انشاء اللہ" کہ اگر خدا کو منظور ہو۔ پس یہی تو کمال ہے ایسے ہی بیٹے کی نسبت کہتے ہیں۔

شاباش آں صدف کہ چناں پرورد گہر آباء ازو مکرم و ابناء عزیز تر۔

تو یہ بھی اس کی اصل۔ چنانچہ اسمٰعیل علیہ السلام راضی ہو گئے ابراہیم علیہ السلام نے چھری ہاتھ میں لیکر ذبح کے لئے لٹایا۔ اسماعیل علیہ السلام کا یہ استقلال کمال میں ابراہیم ع سے زیادہ نہیں۔ بڑا کمال تو ابراہیم علیہ السلام کا ہے کیونکہ خودکشی کرتے تو بہتوں کو دیکھا ہوگا یا کم از کم سنا ہوگا۔ مگر فرزند کشی کون کر سکتا ہے بھلا باپ سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری چلادے۔ والنادر کالمعدوم اب بتلایئے، استقلال کس کا بڑھا ہوا ہے ایک محتمل عبارت فانظر ماذا تری سے یہ سمجھ لینا کہ ابراہیم علیہ السلام میں استقلال کم تھا کتنی بڑی غلطی ہے اگر نور محمدی ص کے جدا ہو جانے سے وہ غیر مستقل ہو گئے تھے۔ تو اچھا پھر وہ چھری چلانے کے وقت مستقل کیونکر ہو گئے۔ حضور ص کے نور کے برکات تو اس قدر غیر محدود ہیں کہ وہ مفارقت بدن ابراہیم علیہ السلام کے بعد ویسا ہی نور بخش تھا۔ جیسا کہ مفارقت ناسوت کے بعد بھی ناسوت کے لئے نور بخش ہو رہا ہے جن انوار کا آپ مشاہد کر رہے ہیں۔

(روح العج والثج ص۱۸)

۶۸۔ مقتدا بنانے کے لئے عوام کا غلط معیار

وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ سے تو اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی۔ اور سبیل من اناب سے علاج ہے اس جماعت کا ہر کس و ناکس کے معتقد ہو جانے والے ہیں۔ اور اتباع کا صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے کیونکہ اس جملہ سے حق تعالیٰ نے اتباع کا صحیح معیار۔ . . . بتلا دیا اور معیار سے مراد ہے معیار صحیح ورنہ یوں تو معیار آجکل بہت ہیں۔ جیسے کشف کہ بعض نے اسی کو اتباع کا معیار بنایا اور ہر صاحب کشف کو بزرگ قابل اتباع سمجھا۔

بعض نے معیار بنایا کرامت کو۔ بعض نے وجد و سماع کو۔ بعض نے حرارت کو کہ جس کے اندر حرارت زیادہ ہوا اور بہت روتا ہو۔ وہ بزرگ ہے۔ بعض نے معیار بنایا تصرفات کو کہ ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور مدہوش ہوگیا۔ تو سمجھئے کہ بڑا بزرگ ہے۔ اور بعض نے معیار بنایا تجرد کو۔ گو بعض حالتوں میں اس کی اجازت ہے مگر یہ معیار تو نہیں۔ بعض نے معیار بنایا تند مزاجی کو۔ چنانچہ سب سے زیادہ اس کے معتقد ہوتے ہیں جو پتھر ڈھیلے مارے۔ وہ تو ان پر ظلم کرتے ہیں اور یہ ان کے معتقد ہوتے ہیں اور جو گالیاں دیتے ہیں۔ یہ ان کو بھی کہتے ہیں کہ مجذوب ہیں کیونکہ صاحب کشف ہیں۔ سو کشف ان کے نزدیک بڑا کمال ہے حالانکہ کشف مجنونوں کو بھی ہوتا ہے چنانچہ میرے یہاں ایک عورت کو جنون ہوا۔ تو اس کو کشف ہوتا تھا مگر جب مسہل دیا گیا تو اس کے ساتھ کشف بھی ختم ہوگیا۔ شرح اسباب میں لکھا ہے کہ مالیخولیا کے مرض میں کشف ہونے لگتا ہے۔ پس کشف کوئی کمال کی بات نہیں۔

بزرگی کیا ہے؟

غرض بزرگی کے معیار عجیب وغریب مقرر کر رکھے ہیں اور وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو خبر نہیں کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ اس فن میں کو جانتے نہیں اور یہ لوگ تو کیا اکثر اہل علم بھی نہیں جانتے کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ میں نے اہل علم کو بھی دیکھا کہ اکثر ایسوں کے معتقد ہو جاتے ہیں اور بعضوں نے نزدیک بزرگی کا معیار یہ ہے کہ وہ ان گھڑت باتیں بکیں۔ ہمارے یہاں ایک شخص تھا۔ اس سے اکثر سٹے والے جاتے تھے کہ ہم جیتیں گے یا ہاریں گے۔ وہ اس کے جواب میں بڑبڑانے لگتا۔ ان لوگوں نے کچھ اصطلاح مقرر کر رکھی تھی اس اصطلاح کے موافق اس کی بکواس سے اپنا جواب سمجھ لیتے تھے یہ حال ہے لوگوں کے اعتقاد کا۔ کہ کوئی شخص صوفی بن جائے۔ پھر اس کی ہر بات بزرگی ہو جاتی ہے خاموش رہیں تو خاموش شاہ کہلائیں اور گالیاں اور خلاف شریعت کریں تو مجذوب کہلائیں۔

بی بی تمیزہ کا وضو

ایک دفعہ بزرگی رجسٹری ہونی چاہیئے پھر وہ ایسی پختہ ہو جاتی ہے۔ جیسے بی بی تمیزہ کا وضو۔ مشہور ہے کہ بی بی تمیزہ نام کی ایک فاحشہ عورت تھی۔ ایک بزرگ نے اسے نصیحت کی اور وضو کروا کے نماز پڑھوائی اور تاکید کر دی کہ ہمیشہ اسی طرح پڑھا کرنا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے ایک مدت کے بعد وہ پھر ان کو کہیں ملی تو انھوں نے اس سے دریافت کیا کہ نماز پڑھا کرتی ہو۔ اس نے کہا

جی ہاں پڑھا کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا اور وضو بھی کیا کرتی ہو۔ اس نے جواب دیا کہ وضو اس روز آپ نے کرا نہیں دیا تھا۔ سو جیسا اس کا وضو پکا تھا کہ بدکاری سے ٹوٹا نہ ہگنے سے نہ موتنے سے آجکل کی بزرگی بھی ایسی ہی پختہ ہے کہ اس میں کسی طرح خلل نہیں آتا۔ حتی کہ اگر نماز بھی نہ پڑھیں تب بھی بزرگ ہی ہیں۔

بزرگی کیا ختم نہیں ہوتی ہے

غرض ایک مرتبہ جس سے اعتقاد ہو گیا پھر خلل نہیں پڑتا ہاں ایک صورت سے خلل پڑتا ہے شریعت کی بات بتلانے لگے ایسا کرے تو کہتے ہیں کہ میاں یہ تو نرا ملّا ہے۔ اور جو شریعت کے خلاف کرے تو اس کو سمندر کہتے ہیں اس کو کوئی معصیت گندہ نہیں کر سکتی یہ تو سمندر ہے۔ سمندر میں چاہے کتنی ہی نجاست پڑ جائے اس کو ناپاک تھوڑا ہی کر سکتی ہے لیکن اگر سمندر پیشاب ہی کا ہو تو کیا تب بھی پاک ہوگا۔ سو یہ حضرت تو سر سے پیر تک گوہ ہی میں بھرے ہوئے ہیں ایک پیر صاحب اپنی مریدنی کا گانا سن رہے تھے۔ گانا سنتے سنتے آپ کو مستی سوار ہوئی۔ اور تخلیہ میں لے جاکر اس کے ساتھ منہ کالا کیا اور وہاں سے باہر آکر فرماتے ہیں کہ جب آگیا جوش نہ رہا ہوش مگر مریدوں کے نزدیک پھر بھی بزرگ ہی رہے۔ سبحان اللہ کیا اچھی بزرگی ہے۔ چاہے ایسا ہی کام کریں مگر پھر بھی بزرگ کے بزرگ۔ خلاصہ یہ کہ ملانوں نے وہ ذرگت بنائی کہ یا تو اتباع ہی نہ تھا۔ اگر ہوا تو بلا معیار ہوا۔ اور اتباع کی شکایت تھی۔ پھر جب اتباع ہوا تو ایسا کہ اس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں۔ سو یہ وہ قصہ ہوا کہ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی۔

(وعظ اتباع المنیب ص۲۰)

۶۹ - پیشوا بنانے کا صحیح معیار

سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ کا اتباع کرو۔ اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھئے واتبع من اناب الی نہیں فرمایا۔ کیونکہ اس میں ابہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں اس لئے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا واتبع سبیل من اناب الی کہ وہ خود

متبوع نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے ۔ وہ ہے متبوع یہ ہے اتباع کا معیار ۔ کہ جس شخص کا اتباع کرو ۔ اس کو دیکھ لو کہ وہ صاحب انابت ہے یا نہیں ۔ جو صاحب انابت ہو اس کا اتباع کرو ۔ سبحان اللہ کیا عجیب معیار ہے پس اتباع اس معیار کے موافق کرنا چاہیئے اور سب معیار چھوڑ دینے چاہئیں ۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ کو معیار بنایا ۔ اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو مانے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے ۔ اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں ۔ پس اس سے معلوم ہوگیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے کہ اس کے افعال درست ہوں ۔ پس اب من اناب الی سے مراد وہ شخص ہوا جو کہ باعمل ہو ۔ اور عمل بدون علم کے ہو نہیں سکتا ۔ تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہو ۔ بس دو چیزیں اصل ٹھہریں ۔ ایک علم دین اور عمل دین ۔ اور اب تک جتنے معیار لوگوں نے مقرر کر رکھے ہیں ۔ ان میں نہ عمل ہے نہ علم ۔ اور علم و عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے وہ توجہ الی اللہ ہے ۔ پس سب سے اول تو علم ہونا چاہیئے اور پھر اس پر مرتب ہونا چاہیئے کہ عمل اور توجہ الی اللہ ہو ۔ سبحان اللہ کیا جامع کلام ہے کہ ایک اناب کے لفظ میں تینوں امور علم و عمل اور توجہ الی اللہ کی طرف اشارہ فرمادیا ۔ بس اب معلوم ہوا کہ کامل اور اتباع کے قابل وہ ہوگا کہ جسمیں یہ تینوں باتیں ہوں ۔

(اتباع المنیب ص۲۸)

۷۰ ۔ بعض لوگ حج کے بعد بدعمل کیوں ہوجاتے ہیں ؟

بات یہ ہے کہ حجر اسود کسوٹی ہے ۔ اس کو چھونے کے بعد انسان کا اصلی رنگ ظاہر ہوجاتا ہے جو حالت پہلے سے مخفی تھی وہ اب کھل جاتی ہے ۔ اگر طبیعت میں نیکی تھی تو پہلے سے زیادہ

ؔ وہ اسکو اپنی طرف راہ دیکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے ۱۲

نیک ہوجاتا ہے اگر بدی تھی تو وہ بدی اب نکل جاتی ہے ۔ بہت لوگ ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں مگر کسوٹی پر لگانے سے کھرا کھوٹا معلوم ہوجاتا ہے ۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد ۔۔۔ اے بسا خرقہ کو مستوجب آتش باشد
خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں ۔۔۔ تا سیہ روئی شود ہر کہ درو غش باشد

شاید تم کہو کہ اچھا ہوا تم نے یہ بات ظاہر کردی ۔ اب تو ہم حج ہی کو نہ جائیں گے ۔ نہیں صاحب حج کو جاؤ مگر اکسیر بن کر جاؤ اور لو میں تم کو اکسیر بننے کا طریقہ بھی بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ کسی کیمیا گر سے تعلق پیدا کر لو ؎

کیمیا ئیست عجیب بندگی پیر مغاں ۔۔۔ خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

کیمیا گر سے میری مراد یہ لنگوٹی باندھنے والے نہیں کھتے ہیں بلکہ باطن کے کیمیا گر مراد ہیں جن کو اہل اللہ کہتے ہیں ان کی شان یہ ہوتی ہے ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد ۔۔۔ فی الحال بصورت طلا باشد

پارس ایک پتھر ہوتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ جہاں لوہے کو اس سے مس کیا فوراً سونا بن جاتا ہے ۔ اہل اللہ کی تو یہ خاصیت مشاہد ہے پارس میں یہ بات ہو یا نہ ہو اہل اللہ کی صحبت سے توبہ نصوح حاصل ہوجاتی ہے جس سے پہلی تمام گندگیاں دُھل جاتی ہیں ۔ پس تم کو چاہیئے کہ کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کرکے حج کو جاؤ ۔ اس کی صحبت سے تم کو توبۂ خالص عطا ہوگی توبہ کرکے جاؤ گے تو پھر حج کا یہ اثر ہوگا کہ پہلے سے زیادہ تم کو اعمال صالحہ کی توفیق ہوگی ۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مرید ہوکر جاؤ ۔ اس کی ضرورت نہیں صرف تعلق محبت اور چند روزہ صحبت کی ضرورت ہے ۔ (محاسن الاسلام ص۳۷)

۷۱ ۔ جب کہ بُری باتوں سے بچانا نماز کا خاصہ ہے تو پھر اس کے خلاف کیوں ہوتا ہے

اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نماز کس شان کی پڑھتے ہیں ۔ اے صاحب ! آپ کی نماز کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ مجھے آدمی کی ضرورت ہے اور آپ اس کے سامنے ایک

اپاہج مضغہ[1] گوشت کو لاکر پیش کر دیں اور جب وہ کہے کہ میں اپاہج کو لیکر کیا کروں؟ یہ بھی کوئی آدمی ہے؟ آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ صاحب تم نے آدمی کو کہا تھا میں نے آدمی لادیا۔ دیکھ لو یہ حیوان ناطق ہے یا نہیں؟ تو بیشک وہ معقولی آدمی تو ہے مگر معقول آدمی نہیں وہ اس قابل نہیں ہے جس سے آدمیوں کے کام لئے جائیں گے۔

بس یہی حال ہماری نماز کا ہے کہ نام کو تو نماز ہے مگر اس کی شان یہ ہے

ہماری نمازیں

کہ اس کے نہ ہاتھ ہیں نہ پیر ہے نہ منہ ہے نہ سر ہے نہ آنکھیں۔ اگر ہاتھ ہے تو سر کٹا ہوا ہے سر ہے تو آنکھیں اندھی ہیں۔ اہل حقیقت تو ایسی نماز کو کالعدم سمجھتے ہیں جیسے اپاہج مضغہ گوشت کو کالعدم سمجھا گیا تھا۔ مگر فقہاء نے یہ دیکھ کر کہ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔ اگر نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا لوگ اسے بھی چھوڑ بیٹھیں گے اس پر صحت کا حکم لگا دیا ہے۔ مگر یہ حکم صحت ویسا ہی ہے جیسے آپ نے اس اپاہج کو حیوان ناطق ہونے کی وجہ سے آدمی کہا تھا پس ایسے ہی آپ کی نماز اصطلاحی نماز تو ہے مگر حقیقی نماز نہیں ہے۔

صورت نماز بھی فائدہ سے خالی نہیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کو بیکار سمجھکر چھوڑ دیں۔ نہیں صاحب بالکل بیکار یہ بھی نہیں۔ نہ ہونے سے اس کا ہونا پھر بہتر ہے کیونکہ بعض دفعہ اگر نظر عنایت ہوجاوے تو حق تعالیٰ کے یہاں صورت بھی قبول ہوجاتی ہے۔ مولانا نے ایسی نماز کے قبول ہونے کی عجیب مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

این قبول ذکر تو از رحمت است　　　چوں نماز مستحاضہ رخصت است

یعنی جس طرح عورت مستحاضہ[2] کی نماز شرعاً صحیح مانی گئی ہے حالانکہ نماز کے اندر بھی اس کا خون جاری ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ناپاک ہے مگر محض رحمت کی بناء پر اس کو قبول کرلیا جاتا ہے۔ یہی حالت ہماری تمام نمازوں کی ہے کہ گو حقیقت کے لحاظ سے وہ کالعدم ہیں مگر حق تعالیٰ کی نظر عنایت سے کبھی یہ بھی قبول ہوجاتی ہے۔ نیز بعض دفعہ شدہ شدہ یہ نماز حقیقی کی طرف وسیلہ ہوجاتی ہے۔ جیسے بعض طلبہ بدشوق ہوتے ہیں نہ مطالعہ کرکے پڑھتے ہیں نہ پڑھکر دیکھتے ہیں تو ان کا اس وقت پڑھنا نہ پڑھنے کے مثل ہے مگر

---

[1] گوشت کا لوتھڑا۔ [2] وہ عورت جس کو حیض کے علاوہ استحاضہ خون آرہا ہے

شفیق استاذ اس کو مکتب سے نہیں نکالتا۔ اور یہ کہتا ہے کہ گو یہ اس وقت شوقین طالب علم کے برابر نہیں مگر شدہ شدہ شوق کی امید ہے چنانچہ اکثر ایسا ہو بھی جاتا ہے کہ جن طالب علموں کو ابتدار میں شوق نہ تھا جب وہ عرصہ تک کام میں لگے رہے تو ایک وقت میں خود بخود ان کو شوق پیدا ہوگیا انہیں اسباب پر نظر کرکے حضرات فقہاء نے ایسی نمازوں پر صحت کا حکم لگا دیا۔ اور واقعی فقہاء کا وجود بھی امت کے لئے رحمت ہے پس آپ اپنی نماز کو بیکار تو نہ سمجھیں مگر کامل بھی نہ سمجھیں۔

اعتراض کا جواب

اب اعتراض کا جواب ہوگیا کہ نماز کی تاثیر تو حق تعالیٰ نے یہ بتلائی ہے کہ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ[1]۔ اور ہم اپنے اندر یہ اثر نہیں پاتے تو بات یہ ہے کہ یہ شان کامل نماز کی ہے اور آپ کی نماز کامل نہیں۔ اس لئے اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ ہم نماز کو بُری طرح ادا کرتے ہیں جیسے کوئی جوشاندے کو سفوف بناکر پھانک لے تو بتلایئے نفع کیونکر ہو۔ دوسرے یہ کہ جیسی ہماری نماز ہے ویسی اس کی نہی عن الفحشاء بھی ہے۔ اگر کامل نماز ہوتی تو وہ ہم کو تمام فحشاء سے روکدیتی۔ اب ناقص ہے تو کسی قدر فحشاء سے روکدیتی ہے۔ اور اس کا انکار نہیں ہوسکتا تجربہ ہے کہ نمازی آدمی عموماً بے نمازیوں سے کم گناہ کرتے ہیں اور ادنیٰ نفع تو یہی ہے کہ نمازی آدمی کے پاس کوئی کافر بہکانے کے واسطے نہیں آتا کفار جس کو نمازی دیکھتے ہیں اس کو دین کا پابند اور پختہ سمجھکر کچھ نہیں کہتے۔ اس سے وہ ناامید ہوجاتے ہیں کہ یہ ہماری بہکانے میں نہیں آسکتا۔ (انوار الیتامیٰ ص۱۶)

۷۲۔ معراج میں دیدار باری تعالیٰ

دنیا میں خدا کو دیکھنا محال عادی و شرعی ہے۔ محال عقلی تو نہیں کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا۔ اور حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہوگا۔ جیسا کہ نصوص سے ثابت ہے۔ اور دنیا میں بھی وجہ استحالۂ رویت اُدھر سے نہیں بلکہ ہماری طرف سے ہے ہم اس کے متحمل نہیں۔ ورنہ حق تعالیٰ میں خفار نہیں وہ تو یہاں بھی ظاہر ہیں اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ حق تعالیٰ کی

---

[1] وہ بُری اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے۔

صفت باطن بھی تو ہے چنانچہ نص میں ہے۔ ھُوَ الظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ پھر تمہارا یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں۔ صفت باطن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا ہے اس کا جواب محققین نے یہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ جو باطن ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں خفا ہے بلکہ غایت ظہور سے بطون ہوگیا رہا یہ کہ غایت ظہور سے بطون کیسے ہوگیا۔ اس سے تو ظہور ہونا چاہئے تھا تو بات یہ ہے کہ ہمارے ادراک کے لئے غَیبت[1] وخفا کی بھی ضرورت ہے۔ اگر کسی چیز میں غیبت بالکل نہ ہو اس کا ادراک . . . . . . نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ادراک التفات[2] سے ہوتا ہے اور التفات غَیبت کی وجہ سے ہوتا ہے جو چیز من کل وجہ حاضر ہو۔ اس کی طرف التفات نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی روح حالانکہ بہت ظاہر ہے اور انسان سے جتنا قرب روح کو ہے کسی چیز کو بھی نہیں پھر بھی روح کا ادراک نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی درجہ غَیبت کا نہیں۔ اس لئے اس کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا اور جب التفات نہیں تو ادراک کیسے ہو اسی طرح بلاتشبیہ کیونکہ یہ تشبیہ بھی ناقص ہے حق تعالیٰ میں چونکہ کوئی درجہ غَیبت وخفا کا نہیں۔ اس لئے وہ بوجہ غایت ظہور کے باطن ہیں ہم کو دھوپ کا ادراک اس لئے ہے کہ وہ کبھی غائب بھی ہوجاتی ہے اگر غائب نہ ہوتی تو آپ اس کو دیکھتے تو مگر ادراک نہ ہوتا۔ دھوپ کا ادراک ظلمت ہی کی وجہ سے ہے اور ظلمت خفاء نور ہی کا نام ہے۔ نیز اگر غَیبت نہ ہو تو پھر روشنی سے لذت بھی نہ آتی۔ دن میں جو لذت ہے وہ اسی لئے ہے کہ رات میں دھوپ غائب ہوجاتی ہے ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے نہ دہد لذتِ حضور۔

غرض چونکہ حق تعالیٰ ہر وقت ظاہر ہیں۔ اسی لئے مخفا ہوگیا کیونکہ

دیدار الٰہی

ہمارا ادراک ایسا ضعیف ہے جو غائب من وجہ کے ساتھ ہی متعلق ہوسکتا ہے ظاہر من کل وجہ کے ساتھ متعلق نہیں ہوسکتا۔ ہاں آخرت میں یہ ادراک توی ہوجائے گا۔ تو ظاہر من کل وجہ کے ساتھ بھی متعلق ہوگا۔ وہاں روح کا بھی انکشاف ہوگا اور حق تعالیٰ کا بھی دیدار ہوگا اور معلوم ہوجائے گا کہ حق تعالیٰ تو بے حجاب تھے حجاب ہماری طرف سے تھا ہماری آنکھوں میں اس وقت اس کے دیکھنے کی قوت نہیں جیسے خفاش میں

---

[1] پوشیدگی [2] توجہ

آفتاب کے دیکھنے کی قوت نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

شد ہفت پردہ برچشم ایں ہفت پردۂ چشم
بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

یعنی آنکھ کے سات پردے ہی دیدار سے مانع ہوگئے ہیں تو یہ آنکھ خود ہی مانع ہو رہی ہے ادھر سے مانع کوئی نہیں۔ اگر آفتاب چمک رہا ہے اور تم آنکھ پر ہاتھ دھر لو تو مانع تمہاری طرف سے ہوگا آفتاب کو مخفی نہ کہا جاوے گا اور وہ جو حدیث میں آخرت میں حجاب کا ذکر آتا ہے لا یبقی علیٰ وجھہ الا رداء الکبریاء[1]۔ وہ حجاب ادراک کنہ سے مانع ہے دیدار سے مانع نہیں۔ آخرت میں ہماری آنکھوں کی قوت بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے تو مگر کنہ کا ادراک نہ ہوگا۔ اور رویت کے لئے ادراک کنہ لازم نہیں۔ ہم یہاں بھی بہت چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر کنہ کا ادراک نہیں ہوتا۔ بہرحال دنیا میں رویت الٰہی محال عادی ہے چنانچہ حدیث مسلم ہے۔ انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا (تم اپنے رب کو نہیں دیکھ سکو گے یہاں تک کہ تم کو موت آجائے) اور نص میں موسیٰ علیہ السلام کی درخواست دیدار کے جواب میں ارشاد ہے۔ لَنْ تَرَانِیْ[2]۔ یہ جواب قابل دید ہے حق تعالیٰ نے لن ترانی فرمایا ہے لن اریٰ نہیں فرمایا۔ بتلا دیا کہ میں تو اب بھی قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں مگر تم میں قوت دیدار نہیں تم مجھے اس وقت تک نہیں دیکھ سکتے۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ کیونکہ دنیا میں رویت محال عادی ہے ہاں تجلی ہوئی تھی اور حق تعالیٰ نے حجابات اٹھا دیئے تھے مگر موسیٰ علیہ السلام دیکھنے سے پہلے ہی بے ہوش ہوگئے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار الٰہی معراج میں ہوئی ہے۔

البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت اختلاف ہے کہ معراج میں آپ نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں۔ اس میں اکثر علماء اور صوفیہ اور

---

[1] اس کے چہرہ پر کبریائی کی چادر کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی ہے۔ [2] تو ہرگز مجھے نہ دیکھ سکے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا قول یہی ہے کہ آپ نے دیکھا ہے مگر اسی کے ساتھ محققین کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ آیاتِ سورۂ نجم کی تفسیر اس حدیث سے صحیح نہیں ہے کیونکہ عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ذُوْمِرَّۃٍ۔ یقینا حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں ان صفات کا عنوانِ بیان اس کو مقتضی ہے کیونکہ حق تعالیٰ پر شدید القویٰ کا اطلاق نہیں ہوسکتا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب آگے چلئے۔ فَاسْتَوٰی وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی بھی انہی کی صفت ہوسکتی ہے کا مرجع جبرئیل علیہ السلام ہی ہیں کیونکہ اِسْتَوٰی بالافق بھی انہی کی صفت ہوسکتی ہے اس کے بعد ثم دنا فتدلیٰ فکاب قوسین او ادنیٰ میں سب ضمیریں جبرئیل علیہ السلام ہی کی طرف راجع ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف راجع نہیں ورنہ انتشار ضمائر لازم آئے گا یہ رویت جبرئیل تو دنیا میں ہوئی تھی آگے فرماتے ہیں۔ وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی ۔ یہ دوبارہ رویت سدرۃ المنتہیٰ پر ہوئی اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو بہت دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں اصلی صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے وہ دو مرتبہ ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھی تھی۔ آپؐ نے فرمایا۔ **ھو جبرئیل**۔ یعنی یہ رویت جبرئیل علیہ السلام کی تھی، باقی جو علماء معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ رویت کے قائل ہیں وہ دوسرے دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ آپؐ نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا ہے اور ان کی سند صحیح ہے حضرت ابن عباسؓ کا قول تو مسلم میں ہے۔ اور سیوطی نے مستدرک حاکم سے اس باب میں حدیث مرفوع نقل کی ہے بس قرآن میں گو اس رویت کا ذکر نہیں۔ مگر جب یہ حضرات صحابی رضی اللہ عنہم اس کا اثبات کرتے ہیں تو یقیناً انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی وجہ

اب ان علماء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قاعدہ سے کہ دنیا میں رویت محال عادی ہے مستثنیٰ کیا ہے کیونکہ دلیل سے آپ کا دیکھنا ثابت ہوچکا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں استحالۂ رویت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی ورنہ مرئی میں تو کوئی مانع ہی نہیں مگر شیخ ابن عربی

نے عجیب تحقیق لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ کو میں استثناء کی ضرورت نہیں بلکہ یہ اپنے عموم پر بحالہا باقی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت سے اس پر نقض وارد نہیں ہوتا کیونکہ ہم تو معراج میں رویت کے قائل ہیں۔ اور معراج عرش تک ہوئی ہے اور سمٰوات و عرش مکان آخرت ہیں۔ وہ دنیا میں داخل نہیں بلکہ اس سے خارج ہیں تو ممکن ہے کہ اس مکان کی یہ خاصیت ہو کہ جو شخص وہاں پہونچ جاوے خواہ مرنے کے بعد یا مرنے سے پہلے اس میں قوت تحمل[1] رویت پیدا ہوجائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر موجود ہیں اور وہ وہاں کھانے پینے اور بول و براز[2] سے منزہ ہیں صرف ذکر اللہ سے ان کی حیات ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں ہیں بلکہ مکان آخرت میں ہیں اور مکان کی خاصیت مکان دنیا سے الگ ہے۔ اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ غذا سے فضلات پیدا ہوں تو ممکن ہے وہاں کی یہ خاصیت ہو کہ فضلات پیدا نہ ہوں۔ اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ حرکت سے حرارت بدن تحلیل ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ وہاں کی یہ خاصیت نہ ہوں۔ اسی طرح یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن نہ ہو اور وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن ہو۔ یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک دن موت ضرور آتی ہے وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے اسے کبھی موت نہ آئے جیسے کسی شاعر نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے۔ ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید۔ گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

دنیا و آخرت میں فرق

خیر یہ تو شاعرانہ مبالغہ ہے مگر اتنی بات تو مشاہدہ ہے کہ دنیا میں بھی ہر جگہ یکساں خاصیت نہیں۔ بلکہ بعض جگہ کی کچھ خاصیت ہے بعض شہروں کی کچھ خاصیت ہے بعض ملکوں میں عمریں کم ہوتی ہیں اور بعض ملکوں میں لمبی لمبی ہوتی ہیں بعض مقامات کے آدمی کمزور ہوتے ہیں اور بعض مقامات کے بہت قوی اور توانا و تندرست ہوتے ہیں بعض ملکوں میں بیماریوں کی کثرت ہے آئے دن طاعون و ہیضہ پھیلا رہتا ہے۔ اور بعض ملکوں میں کوئی ان بیماریوں کا نام بھی نہیں جانتا۔ جب ایسا اختلاف خاص دنیا کے مکانات

---

[1] برداشت۔ [2] پاخانہ پیشاب

میں بھی مشاہد ہے تو اس میں کیا اشکال ہے کہ مکان آخرت کی خاصیت دنیا سے بالکل الگ ہو ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کیا وجہ ہے اس تحقیق سے سب معادیات سہل ہو جاویں گی۔ اب نہ وزن اعمال میں اشکال ہے نہ رویت خداوندی میں کچھ شبہ ہو سکتا ہے معتزلہ کی عقل ماری گئی جو انہوں نے خواہ مخواہ ان امور کا انکار کیا جس کا منشا بجز قیاس الغائب علی الشاہد کے کچھ نہیں اور قیاس کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔

غرض شیخ ابن عربی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو زمان آخرت ہے اور ایک مکان آخرت ہے زمان آخرت تو مرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور مکان آخرت اسی وقت موجود ہے۔

چنانچہ جنت اور دوزخ کے بارے میں جملہ اہلسنت کا قول ہے کہ وہ اس وقت موجود ہیں۔ تو کیا وہ دنیا میں ہیں۔ اگر دنیا میں ہیں تب تو اس شخص کا قول صحیح ہو جاویگا جو کہتا ہے کہ ہم نے تمام دنیا کا جغرافیہ پڑھا۔ جنت و دوزخ کا اس میں کہیں پتہ ہی نہیں۔ اس کا جواب اہل حق کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ تم نے دنیا کا جغرافیہ پڑھا ہے اور ایک جغرافیہ آخرت کا ہے تم نے وہ نہیں پڑھا۔ وہ تمہارے کورس میں داخل نہیں ہے اس لئے تم کو جنت و دوزخ کا پتہ نہیں چلا۔ اگر آخرت کا جغرافیہ پڑھتے تب ان کا پتہ چلتا۔ بس اہل حق جنت و دوزخ کو دنیا میں موجود نہیں مانتے بلکہ ان کو مکان آخرت میں موجود مانتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت بھی موجود ہے اور جس طرح زمان آخرت میں رویت ممکن ہے اسی طرح مکان آخرت میں بھی ممکن ہے۔ گو دیکھنے والا ابھی زمان آخرت میں داخل نہ ہوا ہو۔ پس قاعدہ مذکورہ منتقض[1] نہیں ہوا۔ جس رویت کو آپ کے لئے ثابت کیا جاتا ہے وہ دنیا میں نہ تھی بلکہ مکان آخرت میں تھی۔ اور دنیا میں آپ کے واسطے بھی رویت ممکن نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام گو قوائے بشریہ میں سب سے اکمل ہیں مگر پھر بھی بشر ہیں۔

(تحصیل المرام صـ ۵)

---

[1] لہ ٹوٹنا۔

۷۳) درود پڑھکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان سمجھنا غلط ہے

اگر کہو کہ ہم درود شریف پڑھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ حضور والا کو اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا آپ لوگوں کو ہوتا ہے ہمیں ارشاد ہے حق تعالیٰ کا کہ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ ہزار روپئے ہیں ہم سے کہو کہ ہم اپنے بیٹے کو دے دیں۔ تو اس نوکر کو مقبول بنانے کو اس کی عزت بڑھانے کو یہ صورت تجویز کی ہے نہ کہ بیٹا روپے ملنے میں اس نوکر کا محتاج ہے۔ اگر نوکر نہ بھی کہے تب بھی روپیہ بیٹے کے لئے تجویز کر لیا گیا ہے صرف نوکر کی عزت افزائی کے لئے ایسا کیا ہے یہی حال درود شریف کا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ رحمت کی دعا کرو۔ رسول کے لئے رحمت بھیجنا تو منظور ہی ہے خواہ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں چنانچہ اس کے قبل اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ موجود ہے مگر ہماری قدر بڑھانے کو ہمیں کہدیا کہ درود بھیجو کہ تمہارا بھی بھلا ہو جاوے گا کوئی شخص کیا منہ لیکر کہہ سکتا ہے کہ آپ ہمارے محتاج ہیں اور اس کہنے پر آپ پر رحمت ہوگی یہ شبہ شاید کسی خشک مزاج کو ہوتا اس لئے رفع کر دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ حق تعالیٰ کا ہے وہ ہماری درخواست پر موقوف نہیں! اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ اور عبادات بعض دفعہ مقبول ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مردود، لیکن درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا۔ سو اگر ہمارے عمل کا آپ پر رحمت نازل ہونے میں کوئی اثر ہوتا ہے تو جیسے اور اعمال ہیں یہ بھی ہمارا عمل ایسا ہی ہونا چاہئے تھا کہ کبھی مقبول اور کبھی مردود ہوتا ہے۔ سو ہمیشہ مقبول ہونا دلیل ہے اس کی کہ معلوم ہو کہ ہمارے عمل کا اس میں کوئی اثر نہیں۔ حق تعالیٰ ضرور رحمت بھیجتے ہی ہیں ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں۔ اس لئے درود شریف کبھی غیر مقبول نہیں ہوتا۔

درود کا فائدہ

بس خدا تعالیٰ کو رحمت بھیجنا ہے ہی۔ ہم کو جو حکم دیا تو صرف ہماری عزت بڑھانے کے لئے نیز ہمارے اعمال ظاہر ہیں کہ

مقبول ہونے کے قابل ہیں نہیں اور جو عمل مقبول نہ ہو وہ کالعدم ہے۔ پھر ہمارا درود پڑھنا کالعدم ہوا۔ مگر پھر بھی آپ پر رحمت ہوتی ہے کوئی شخص یہ احسان نہ سمجھے کہ میں درود بھیجتا ہوں۔ تب ہی رحمت ہوتی ہے اگر ہم آفتاب کے سامنے ہوگئے تو آفتاب نے ہم کو منور کردیا آفتاب ہمارا محتاج شعاع میں نہیں۔ پس علماء کے قول سے بھی اس کی تائید ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے نفع کے محتاج نہیں۔ البتہ اس مقام پر ایک اور شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دین کی تعلیم کی ہے اور ہمارے عمل کرنے سے آپ کو بھی ثواب پہنچتا ہے تو اگر ہم عمل نہ کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ثواب کیسے ملے گا۔ پھر ہمارے عمل کو اس میں دخل ہوا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس نیت سے تعلیم فرمائی تو آپ ہر حال میں ماجور تو ہوگئے۔ اب ہمارے عمل کرنے کا اثر اتنا رہا کہ عمل کرنے سے آپ کا جی خوش ہوتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں امتی نے یہ عمل کیا تو آپ خوش ہوتے ہیں۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کوئی نفع نہیں (ذکر الرسول ص۳)

۷۴۔ مساجد و مجالس کی آرائش فضول حرکت ہے

اس وقت عام طور پر مسجد کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ مجالس اسلامیہ کو آرائش وزیبائش سے بالکل تھیٹر بنا دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں ہم کو ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔

اے حضرات غیر قومیں کہ جن کے سامنے آپ یہ ظاہر کر رہے ہیں آپ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کے برابر دولت آپ کے پاس کہاں ہے اگر وہ بھی ضد باندھ لیں تو یقیناً آپ ان کے مقابلے میں شرمندہ ہوں گے۔ اس لئے آپ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پیروی کیجئے اور کفار کا یہ نفسانی مقابلہ چھوڑیئے بس ایک سچے مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیئے سے۔

دل فریباں نباتی ہمہ زیور بستند   دلبر ماست کہ حسن خدا داد آمد

یہود اپنی زینتیں دکھلائیں۔ نصاریٰ اپنی زینتیں دکھلائیں۔ ہنود اپنی زینتیں دکھائیں

اور ایک مسلمان پھٹا ہوا کرتا پہن کر نکلے گا۔ تو خدا کی قسم سب کی رونقوں کو ماند کر دے گا۔ ارے صاحب! خدا نے وہ حسن آپ کو دیا ہے کہ آپ کو زینت کی حاجت ہی نہیں۔ اے حسین! خدا نے تجھے وہ حسن دیا ہے کہ تیرے حسن کے آگے آفتاب ماہتاب شرماتے ہیں۔ ارے تو! پوڈر ملکے کا ہے کو اپنے قدرتی حسن کو پوشیدہ کرتا ہے۔ تجھے اپنے حسن کی خبر نہیں۔ یہ عارضی حسن تیرے اصلی حسن کو پوشیدہ کئے دیتا ہے۔ متنبی کہتا ہے سے۔

حسن الحضارة مجلوب بتطرية   وفی البداوة حسن غیر مجلوب

یعنی شہر کی عورتوں کا حسن تو بناؤ سنگار سے ہے اور دیہاتی عورتوں کا حسن خداداد ہے واقعی ایک دیہاتی عورت اگر حسین ہو تو بوجہ اس کے کہ اس کے قویٰ بھی اچھے ہوتے ہیں اور محنت کی عادت کی وجہ سے صحت عمدہ اور جسم توانا ہوتا ہے۔ ایک شہر کی حسین عورت سے جو بیسیوں تکلفات سے اپنے حسن کو بڑھا لیتی ہے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے ارے صاحب! مجالس اسلامی کے لئے یہ حسن اور شرف کیا کم ہے کہ وہ اسلام کی طرف حقیقی نسبت سے منسوب ہے تم نے اسلامی مجلس منعقد کی، اس کو شہنشاہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ٹھیرایا۔ اور اس کو اتنا بھی آراستہ نہ کر سکے جتنا کہ دلی کا دربار، اور سلاطین یورپ کے دربار یا یورپ کے بڑے بڑے تھیٹر۔ تو تم نے گویا ایک نقل کی اور کوّے کی طرح ہنس کے مقابلہ میں ذلیل ہوئے۔

مجلس اسلامی کی شان

ارے صاحب! مجلس اسلامی ایسی ہو کہ دور سے دیکھ کر خبر ہو جاوے کہ یہ مجلس اسلامی ہے یہ کسی ناچ رنگ یا تھیٹر یا سرکس کا اسٹیج نہیں ہے۔ باہر سے مجلس بالکل سادہ ہو۔ اس کے بعد اندر پہنچیں تو صحابہ رض کا رنگ جھلکتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ بازاری عورتوں کی طرح گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوئے۔ لباس نہایت پر تکلف اور ایک ایک چیز اور ہر ہر ادا سے رؤسا کا سا تکبر نمایاں ہو۔ اور حقیقت کا پتہ نہیں۔ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ زیب و زینت وہ شخص کرتا ہے جس کے پاس مال ہے کمال نہیں ہے ورنہ بجائے مال کے اپنے کمال کا اظہار کرتا۔ اور اب .. . . . کمال نہ ہونے سے مال کا اظہار کر رہا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے

ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ گنجا آدمی اپنے سر کا عیب چھپانے کے لئے خوب صورت ٹوپی کا اہتمام کرتا ہے اور جس کا سر اور بال درست ہوں وہ تو یہ چاہے گا کہ ٹوپی ہی نہ ہو تو بہتر ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسی خوبصورت مانگ اور کتنے اچھے بال ہیں۔ حضرات میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر قلب میں حقیقت ہے تو ظاہری آرائش سے نفرت ہوگی اور اگر حقیقت سے کورے ہیں تو ظاہری شان وشوکت سے اس کی لیپ پوت کریں گے مجالس اسلامیہ میں کیسا بناؤ۔ اسلام کی طرح مجالس اسلامیہ میں بھی سادگی ہونی چاہیئے۔

غرض انجمنوں میں بہت سے واعظین کا جمع کرنا یہ سب اسی افتخار اور رمود و اظہار کے لئے ہوتا ہے اور اس میں ایک غرض اور بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ کوئی کسی واعظ کو پسند کرتا ہے کوئی کسی کو سب کو جمع کر لو۔ تاکہ ہر مذاق کے لوگ جمع ہوں اور جلسہ میں خوب رونق ہو۔ میں کہتا ہوں اگر آپ صحیح غرض کے لئے جلسہ کر رہے ہیں تو آپ کو لوگوں کے مذاق کی کیا ضرورت ہے اگر کوئی روپیہ تقسیم کر رہا . . . .
تو سائل خود بخود جمع ہو جائیں گے اس اشتہار کی کیا ضرورت ہے جو سائل روپیہ لینے آئے گا اسے مٹھائی بھی ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے روپیہ جعلی ہے۔ اگر سودا کھرا ہے تو بغیر قافیہ اور سجع ملائے بک جائے گا ورنہ مقفیٰ اور مسجع عبارت بولنا پڑے گی۔ حضرت اپنا متاع خالص رکھیئے۔ دیکھئے خود بخود خریدار آئیں گے اسی طرح حق ایسی چیز نہیں کہ اسکی طرف کشش نہ ہو۔ اہل حق اور ملمع سازوں کے کلام میں بھی فرق کہ ملمع سازوں کی آمد بڑی رنگین ہوتی ہے اور اس میں بڑا زور وشور ہوتا ہے مگر حاصل سوائے قافیہ بندی کے کچھ نہیں ہوتا۔

اہل حق کا کلام

اہل حق کے کلام میں ابتداء تو بہت دھیمی ہوتی ہے۔ مگر انتہاء میں روز افزوں قوت اور خاص اثر ہوتا ہے ابتداء ان کی ہلکی بارش کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے جو کہ قلب میں آہستہ آہستہ ایسی بارش کی طرح جذب ہو جاتی ہے مگر اس کا انتہائی اثر گلزار اور گل بار ہوتا ہے۔ بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ — خاک شو تا گل بروید رنگ برنگ

اور ملمع ساز اپنا رنگ جمانے کے لئے ابتداء میں خوب مثنوی کے اشعار پڑھتے ہیں

اور کہیں کہیں اب تو ڈھولک ستار اور ہارمونیم سے بھی مجلس وعظ کو گرم کیا جاتا ہے مضامین کے الفاظ بھی دلگداز ہوتے ہیں کہ اس وقت تو ذرا سا جوش پیدا ہو جاتا ہے پھر جہاں مجلس برخاست ہوئی اثر بھی تشریف لے گیا اور جو ذرا سا باقی رہ گیا وہ دو چار روز کا مہمان ہوتا ہے اور اہل حق کا اثر پائدار ہوتا ہے۔ مگر کلام ان کا رنگین نہیں ہوتا پس ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسا یک چمکدار گلٹ کے چمچے اور زنگ آلود روپئے میں روپیہ کا رنگ اگر نہ بھی چھوڑاؤ وہ ب بھی سولہ ہی آنے کو چلتا ہے اور گلٹ کے چمچہ پر اگر گلٹ بھی چڑھا رہے پھر بھی اسے وئی نہیں پوچھتا اور اگر وہ بھی اتر جاوے تو پھر وہ کچھ بھی نہیں۔ غرض روپئے کو سفیدی ور چمک کی حاجت نہیں اور وہ جو گلٹ کا چمچہ اپنے سفید ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ ور بظاہر روپئے سے بھی زیادہ چمکدار ہے . . . . . اس کی سفیدی ور چمک تھوڑے دنوں کی ہے کہ اس کے بعد دو کوڑی کا بھی نہ ملے گا ؎

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بے غش باشد۔
اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد۔

جب یہ کسوٹی آئے گی تو روپیہ تو سامنے آ کھڑا ہوگا اور گلٹ کا چمچہ منہ چھپاتا پھرے گا ؎

نہ باشد اہل باطن در پئے آرائش ظاہر۔
بہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را۔

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت سادہ زندگی تھی۔ آپ میں لف اور ظاہری وجہ میں کوئی شان وشوکت نہ تھی۔ کیونکہ آپ سچے تھے باوجود یکہ آپ اعلیٰ جہ کے قادر اور انتہا درجہ کے متین تھے مگر ساتھ ہی اس کے نہایت بے تکلف تھے۔

(اصلاح الیتامیٰ صـ۱۲)

۷۵۔ حضرات انبیاء علیہم السلام واولیائے کرام کی حیات برزخیہ کا اثبات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے لئے بہت کچھ شرف حاصل ہے کیونکہ

جسدِ اطہر اس کے اندر موجود ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود یعنی جسد مع تلبس الروح اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ قبر میں زندہ ہیں۔ قریب قریب تمام اہلِ حق اس پر متفق ہیں۔ صحابہؓ کا بھی یہی اعتقاد ہے حدیث بھی نص ہے۔ انّ نبی اللہ حیّ فی قبرہ یرزق[1] کہ آپؐ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ کو رزق پہونچتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے وہ دوسری قسم کی حیات ہے جس کو حیاتِ برزخیہ کہتے ہیں۔

حیات برزخیہ کے مراتب

باقی یہ کہ حیات برزخیہ تو سب کو حاصل ہے۔ پھر اس میں نبی کی کیا تخصیص ہے؟ تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے مختلف مراتب ہیں ایک مرتبہ تو تمام مومنین کو حاصل ہے جس کے ذریعہ سے تعلیم قبر کی ہر مسلمان کو حس ہوگی۔ دوسری حیات شہداء کی ہوگی تمام مومنین کی حیات برزخیہ سے اقویٰ ہوگی عام مومنین کی حیاتِ برزخیہ بہ نسبت شہداء کے کمزور ہوتی ہے۔ اگرچہ اس حیات ناسوتیہ سے وہ بدرجہا اعلیٰ ہو۔ پس یہ کوئی نہ سمجھے کہ عا مومنین کی حیاتِ برزخیہ اس حیاتِ دنیویہ سے کمزور ہوگی اور حیات شہید کے اقویٰ ہون ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ زمین اس کی لاش کو نہیں کھاسکتی اور یہ نہ کھانا ایک اثر ہے حیا کا۔

شہید کی حیات

پس شہید میں اس کا اثر ظاہر ہونا اور عام مومنین میں نہ ہونا یہ دلیل ہے شہید کے حیات کے اقویٰ ہونے کی بہ نسبت عام کی حیا کے بعض لوگوں نے اس کا انکار بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشاہدہ اس کے خلاف ہوا ہے۔ مگر یہ کوئی انکار کی وجہ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ جس طرح اس کے خلاف مشاہ ہوا ہے اس کے موافق بھی مشاہدہ ہوا ہے جب دونوں طرح مشاہدے موجود ہیں تو سرے سے اس کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے بہت یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ اور نصوص کا محمل بھی اسی کو کہا جائے گا باقی مطلقاً انکار تو صحیح نہیں ہوسکتا۔ یہ تو جواب تسلیمی ہے اس تقدیر پر جب کہ ہم مان لیں کہ جہاں تم نے اس کے خلاف کیا ہے وہ شہید ہی تھا۔ مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ شہید ہی نہ ہو کیونکہ شہادت صرف اسی کا نام نہیں ک

۱؎ اللہ کے نبی اپنی قبر میں بلاشبہ زندہ ہیں رزق پاتے ہیں

فر کے ہاتھ سے قتل ہوجائے بلکہ حقیقی شہادت کے لئے کچھ باطنی شرائط بھی ہیں۔ مثلاً نیت کا خالص لوجہ اللہ ہونا۔ جس کی خبر سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہوسکتی۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس و آپ نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے وہ شہید حقیقی نہ تھا صرف شہید احکام تھا اور حیات اقویٰ درجہ صرف شہید حقیقی کے ساتھ خاص ہوگا اور اگر مان بھی لیا جاوے کہ وہ حقیقی شہید تھا تو ممکن ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے ایسا ہوگا ہو کہ اس کی لاش گل گئی۔ مثلاً اس گہ کی مٹی تیز ہو۔ ہم نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ شہید کی حیات ایسی ہوتی ہے کہ اگر جلاؤ بھی اس کی لاش نہ جلے بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اگر شہید کو موافق عادت کے دفن کردیا جاوے یسا کہ عموماً مردے دفن ہوتے ہیں کہ اس کی قبر میں کوئی خاص عارض دوسروں سے زیادہ ثل شوریت زمین وغیرہ کی نہ ہو تو اس کی لاش مثل دوسرے مردوں کے نہیں گلے گی ینہ محفوظ رہے گی۔

انبیاءؑ کی حیات

تیسرا درجہ جو سب سے قوی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخیہ کا ہے کہ وہ شہید کی حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے چنانچہ اس کا ایک اثر تو محسوس ہے اور وہ وہی ہے جو شہید کے لئے ہے کہ ان کے جسم مبارک کو زمین نہیں کھاسکتی حدیث میں ہے۔ حرّم اللہ اجساد الانبیاء علی الارض۔ اور دوسرا اثر محسوس تو نہیں مگر منصوص ہے اور حرمت نکاح ازواج انبیاء ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج مطہرات سے بعد ان کے وصال کے کسی امتی کو نکاح جائز نہیں نیز انبیاء علیہم السلام کی میراث ورثہ سیم نہیں ہوتی۔ نحن معاشر الانبیاء لانورث ماترکنا صدقۃ انبیاء علیہم السلام ترکہ صدقہ ہوتا ہے یہ باتیں شہید کے لئے شریعت نے مشروع نہیں کیں۔ تو اگرچہ شریعت اس کا کوئی خاص راز نہیں بیان کیا۔ مگر علماء محققین یہی کہتے ہیں اس کا راز قوت حیات ء علیہم السلام ہے کہ حیات مانع ہے ان دونوں امر سے۔ اور گو ازواج نبی سے بعد وفات نبی نکاح حرام ہونا تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے میں منقول نہیں ہوا۔ صرف حضور صلی اللہ سلم کے لئے یہ خصوصیت قرآن میں ذکر کی گئی ہے مگر علماء نے میراث پر قیاس کرکے اس

انبیاء کے جسموں کو زمین پر اللہ نے حرام کر دیا ہے۔

حکم کو بھی عام جملہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کے لئے سمجھتے ہیں اور میراث کا تقسیم ہونا حدیث سے جملہ انبیاء علیہم السلام کے لئے عام طور پر معلوم ہو چکا ہے تو ان امتیازات سے حیات برزخیہ انبیاء کا شہداء اور عوام مومنین سے اقویٰ ہونا ثابت ہوا بہرحال یہ بات باتفاق امت ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبر میں زندہ رہتے ہیں۔

نبی کریم کی حیات

اور خاص ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں تو مخالفین بھی حیات کے معتقد ہیں ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا اقرار ہے چنانچہ ایک واقعہ سے ان کا اقرار معلوم ہوجا[ئے گا]
تاریخ مدینہ میں یہ واقعہ لکھا ہے اور میں نے خود اس تاریخ میں دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند صدی بعد (یاد نہیں رہا کس بادشاہ کے وقت میں) دو شخص مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو نکالنے کے لئے آئے تھے مسجد نبوی کے پاس ایک مکان کرایہ پر لیا تھا اور دن بھر نماز و تسبیح میں مشغول رہتے تھے لوگ ان کے معتقد بھی ہو گئے تھے وہ کم بخت رات کے وقت اس مکان سے قبر شریف کی طرف سرنگ کھودتے تھے۔ اور جس قدر سرنگ کھود لیتے راتوں رات مٹی مدینہ سے باہر پھینک آتے تھے اور جگہ جگہ برابر کر دیتے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کئی ہفتہ تک وہ لوگ سرنگ کھودنے میں مشغول رہے جب ادھر ان لوگوں نے یہ کام شروع کیا حق تعالیٰ نے اس زمانہ کے سلطان کو (نام یاد نہیں رہا) بذریعہ خواب کے متنبہ کر دیا۔

سلطان مدینہ کا خواب

خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کے چہرہ مبارک پر حزن و غم کے آثار ہیں اور آپ اس بادشاہ کا نام لے کر فرمارہے ہیں کہ مجھے ان دو شخصوں نے بہت ایذا دے رکھی ہے۔ جلد مجھے ان سے نجات دو۔ خواب میں دونوں شخصوں کی صورت بھی بادشاہ کو دکھلادی گئی۔ خواب سے بیدار ہوکر بادشاہ نے وزیر سے اس کا تذکرہ کیا وزیر نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے آپ جلد مدینہ تشریف لے جائیں۔ بادشاہ نے فوراً فوج کے ساتھ کے کر بہت تیزی کے ساتھ مدینہ کی طرف سفر کیا۔ اور بہت جلد مدینے پہونچ گیا۔ اس عرصہ میں وہ لوگ بہت سرنگ کھود چکے تھے اور بالکل جسد اطہر کے قریب پہونچ گئے تھے۔ ایک دن کی بادشاہ کو اور تاخیر ہوجاتی

تو وہ لوگ اپنا کام پورا کر لیتے۔ بادشاہ نے مدینے پہونچ کر تمام لوگوں کی مدینہ سے باہر دعوت کی اور سب کو مدینہ سے ایک خاص دروازے سے باہر نکلنے کا حکم کیا۔ اور خود دروازہ پر کھڑے ہوکر ہر شخص کا چہرہ خوب غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مدینے کے سب مرد شہر سے باہر نکل آئے مگر ان دو شخصوں کی صورت نظر نہ پڑی جن کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس لئے بادشاہ کو حیرت سخت ہوئی۔ اور لوگوں سے کہا کیا سب لوگ باہر آگئے۔ لوگوں نے کہا اب کوئی اندر نہیں رہا۔ بادشاہ نے کہا یہ ہرگز نہیں ہوسکتا ضرور کوئی اندر رہا ہے۔

سرنگ کھودنے والے پکڑے گئے

لوگوں نے کہا کہ دو زاہد اندر رہ گئے ہیں وہ کسی کی دعوت میں جایا نہیں کرتے اور نہ کسی سے ملتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ مجھے ان ہی سے کام ہے چنانچہ جب وہ پکڑ کر لائے گئے تو بعینہ وہ دو صورتیں نظر پڑیں جو خواب میں دکھلائی گئی تھیں ان کو فوراً قید کر لیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ایذا دی ہے۔ چنانچہ بڑی دیر کے بعد انہوں نے اقرار کیا کہ ہم نے جسد اطہر نکالنے کے لئے سرنگ کھودی ہے۔ چنانچہ خود بادشاہ نے وہ سرنگ دیکھی تو معلوم ہوا کہ قدم مبارک تک پہونچ چکی ہے۔ بادشاہ نے قدم مبارک کو بوسہ دے کر سرنگ بند کروادی اور زمین کو پانی کی تہہ تک کھدوا کر قبر مبارک کے چاروں طرف سیسہ پلادیا۔ تاکہ آئندہ کوئی سرنگ نہ لگا سکے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مخالفین کو بھی جسد اطہر کے صحیح سالم ہونے کا ایسا پختہ اعتقاد ہے کہ کئی سو برس بعد بھی اس کے نکالنے کی کوشش کی۔ اگر ان کو جسد اطہر کے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو وہ سرنگ کیوں لگاتے۔ محض وہم و شبہ پر اتنا بڑا خطرہ کا کام کوئی نہیں کرتا وہ لوگ اہل کتاب ہیں وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ نبی کے جسم کو زمین نہیں کھا سکتی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق تھے بوجہ عناد کے اقرار نہیں کرتے۔ غرض کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر موافقین و مخالفین سب کے نزدیک بالاتفاق محفوظ ہے۔

(الجبور صـ۱۴)

(۷۶) علم تجوید سے لاپرواہی کرنا ٹھیک نہیں

تجوید کی یہاں تک ضرورت ہے کہ بعض دفعہ اس کی مخالفت سے عربیت جاتی رہتی ہے اور جب لفظ عربیت ہی سے نکل گیا تو قرآن ہی نہ رہا۔ جب نماز میں قرآن نہ پڑھا گیا تو نماز کیسے صحیح ہوگی۔ شاید یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہو کہ تجوید کے نہ ہونے سے عربیت نہیں رہتی مگر میں دلیل سے اس کو ثابت کرتا ہوں سب کو معلوم ہے کہ عربی فارسی اردو جُدا جُدا زبانیں ہیں اور ہر ایک کے خواص الگ الگ ہیں پس جس طرح کسی لفظ کے فارسی یا اردو ہونے کے لئے تلفظ کی صحت شرط ہے اسی طرح لفظ کے عربی ہونے کے لئے بھی تلفظ کا صحیح ہونا شرط ہے مثلاً آپ ایک کپڑے کو گاڑھا کہتے ہیں اس میں "ڑ" کا ہونا اور ہائے مخفی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے بجائے گارا کہے تو آپ اس کو غلط کہیں گے کیونکہ گارا تو مٹی کا ہوا کرتا ہے۔ کپڑے کی کوئی قسم گارا نہیں ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ عربی میں جو لفظ "ثا" سے مرکب ہے وہاں "سین" یا "صاد" پڑھ دینے سے یا "حا" کی "ھا" پڑھنے سے تلفظ غلط اور معنی بدل جاویں گے اس سے تو صحت الفاظ کی ضرورت معلوم ہوئی اب صفات کی بابت میں لکھتا ہوں کہ اردو میں ایک لفظ پنکھا ہے جسمیں "نون" کے خفاء کے ساتھ بولا جاتا ہے اسی طرح رنگ سنگ اور جنگ ہیں جو فارسی الفاظ ہیں نون کو ظاہر کرکے نہیں پڑھا جاتا۔ اب اگر کوئی پنکھے کو باظہار نون پن کھا کہے یا رنگ کو رن گ کہتے تو آپ کہیں گے کہ اردو فارسی نہیں رہی مہمل لفظ ہوگیا لیکن اس کے کہنے سے یا آپ بندھ گئے اسطرح کہ جب اس لفظ میں اظہار نون سے آپ نے اس کا غلط ہونا اور اردو زبان سے نکل جانا مان لیا تو جن لفظوں میں عربی زبان میں اخفاء ہے وہاں بھی ماننا پڑے گا کہ اظہار نون سے وہ لفظ عربی نہیں رہتا تو کیا اب بھی تجوید کی ضرورت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے۔

تجوید سیکھنا فرض ہے

میں تو کہتا ہوں کہ تجوید کا سیکھنا فرض ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا عربی میں پڑھنا فرض ہے۔ اور عربیت کے موافق صحیح تلفظ بدون تجوید کے نہیں آسکتا تو تجوید کا سیکھنا فرض ہوا۔ صاحبو! چاہے آپ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ادھر متوجہ نہ ہوں مگر تجوید کی فی نفسہ بہت ضرورت ہے۔

اور افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف اس لئے توجہ نہیں کہ اس میں دنیا کا بظاہر کوئی نفع نہیں اگر آج ملازمت کے لئے یہ قانون ہو جائے کہ جس کا قرآن باقاعدہ صحیح ہوگا اس کو ملازمت دی جائے گی تو آج یہ سارے بی۔ اے۔ ایم اے قاری ہو جائیں ہم لوگ متاع دنیا کے لئے سب کچھ کرلیتے ہیں۔ اس لئے یہ سارے عذر جو بیان کئے جاتے ہیں محض بہانے ہیں۔ (اسباب الفتنہ ص۲۶)

۷۷ - علماء کا باہمی اختلاف اور ہمارا فرض

یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ علماء میں باہم سخت اختلاف ہے کوئی ایک بات کو حرام کہتا ہے تو دوسرا اس کو جائز کہتا ہے کوئی ایک بات کو سنت کہتا ہے تو دوسرا اسے بدعت بتلاتا ہے اب کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں یا تو سب پر عمل کریں یہ تو غیر ممکن ہے یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں۔ تو ترجیح کی وجہ کیا۔ لہذا بعض نے تو یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! مجھے اس فیصلہ کی تو شکایت نہیں، مگر رونا اس کا ہے کہ جب یہی صورت اختلاف فنون دنیا کے ماہروں میں پیش آئی تو وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا۔ وہاں کسی ایک کو ترجیح دیکر کیوں پکڑا۔ یعنی بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے کوئی کچھ مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ کوئی کچھ۔ اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا ہے اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مریض کے لئے مہلک بتلاتا ہے۔ وہاں آپ نے سب حکیموں کو کیوں نہیں چھوڑا اور یہ کیوں نہیں کہا کہ افسوس اطباء میں اتفاق ہی نہیں۔ اب ہم کس کا علاج کریں بس جاؤ مریض کو مرنے دو۔ ہم کسی کا

بھی علاج نہیں کرتے۔ وہاں ایک حکیم کو ترجیح دیکر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا اپنے وکلاء کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کیا۔ جو علماء کے ساتھ کیا گیا ہے کیا وکلاء میں باہم اختلاف نہیں ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے اور سب کو کیوں نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے۔؟۔

ضروری سمجھنے کے بعد

لیجئے میں ہی اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں۔ جو ایک گہری بات ہے۔ وہ یہ کہ دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جائے دوسرے وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ جن باتوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے ان کو تو کسی اختلاف کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاتا۔ بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلاف کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لیتا ہے اور جن باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ان کو اختلاف وغیرہ کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے وہاں تدبیر و تامل سے ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی۔ یہ قاعدہ ہے طبیعت انسانیہ کا۔ اسی کے موافق یہاں عمل کیا گیا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں۔ جان اور ایمان جان چونکہ عزیز ہے اس لئے اس کی صحت و حفاظت کے اسباب میں اختلاف ہونے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیر خواہوں سے دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ڈاکٹروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے بس اس کا علاج اختیار کرلیں گے۔ اور ایمان عزیز نہیں اس لئے علماء کے اختلاف میں عقل سے کام لینا اور غور و تامل کی محنت برداشت کرنا گوارا نہیں۔ تو اے صاحبو! اگر آپ ایمان کو بھی عزیز سمجھتے ہیں تو علماء میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے جس طرح حکماء میں کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس! آپ کو ایمان عزیز نہیں اسلئے صاف سب کو چھوڑ دیا میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں ہے بلکہ ضرور ہے اور آگے میں یہ بھی بتلادوں گا کہ ان میں سے خطا کس کی ہے مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کردوں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا یہ بے ترتیب اور غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے۔ بعض لوگ اس اختلاف کو دیکھ کر علماء کو رائے دیتے ہیں کہ سب مولویوں کو متفق ہوجانا چاہیئے نااتفاقی بُری چیز ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے۔ یا اس

کے لئے کوئی قید بھی ہے اگر نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہوجاتا ہے تو عدالت کو چاہیئے کہ جب اس کے پاس کوئی مدعی دعویٰ پیش کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ دعویٰ اور انکار سے دونوں میں نااتفاقی کا ہونا ثابت ہوگیا۔ اور نااتفاقی علی الاطلاق جرم ہے۔ تو مدعی اور مدعا علیہ دونوں مجرم ہوئے۔ اگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دنیا بھر میں شور و غل مچادیں گے کہ یہ کون سا انصاف ہے؟ کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنادیا گیا۔ اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہیئے تھا۔ تو آپ عاقل بن کر یہ رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہیئے تھا کہ مدعی اور مدعا علیہ میں جو باہم مخالفت و نااتفاقی ہے ان میں سے حق پر کون ہے اور ناحق پر کون ہے جو حق پر ہوگا اس کی حمایت کی جاتی اور جو ناحق پر ہوتا اس کو سزا دی جاتی۔ لیجئے آپ ہی کے فیصلے سے ثابت ہوگیا کہ نااتفاقی علی الاطلاق جرم نہیں بلکہ نااتفاقی وہ جرم ہے جو ناحق ہو۔ اور جو نااتفاقی بحق ہو وہ جرم نہیں اور اگر کسی معاملہ میں دو فریق ہوجائیں تو ہر فریق کو مجرم نہیں کہا جاسکتا بلکہ جس کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے۔ اور جو بحق ہو وہ مجرم نہیں۔

علماء کی نااتفاقی

پس علماء کی باہم نااتفاقی اور اختلاف سے آپ کا سب کو مجرم بنانا اور ہر فریق سے یہ کہنا کہ دوسرے سے اتفاق کرلو۔ غلط رائے ہے بلکہ اول آپ کو تحقیق کرنا چاہیئے کہ حق پر کون ہے پھر جو ناحق پر ہو اسے مجرم بنائیے اور اس کو اہل حق کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور کرنے کے تو یہ معنیٰ ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کرلیں اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کرسکتا۔ تو اتنی شکایت آپ کی رہ گئی۔ کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہوجانے کی رائے دیتے ہیں اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ صاحب دوسرا فریق بھی اتفاق سے مجبور ہے کیونکہ ان کی سمجھ میں یوں ہی آیا وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آیا ہے تو جناب ایسا اختلاف رحمت ہے اس اختلاف سے فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آیا کرتی۔ دیکھئے ائمہ اربعہ میں سمجھ ہی کا تو اختلاف ہے مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق ہیں کوئی ایک دوسرے پر ملامت و طعن نہیں کرتا بلکہ ہر ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے اگر ایسا اختلاف ہوتا تو۔

مسلمانوں کو آج پریشانی نہ ہوتی جو آنکھوں سے نظر آرہی ہے بلکہ یہ اختلاف تو رد یٹوں کا ہے۔

اختلاف کی بنیادی وجہ

میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہل حق کے پاس کافی زرو ہو۔ اور وہ ان سب فرقوں کی تنخواہیں مقرر کردیں تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے یہ سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے ہے۔ کہ کوئی مولود پر زور دیتا ہے۔ کوئی فاتحہ پر، کوئی تیجے دسویں پر۔ ایک عالم صاحب سے جو بدعات کے بڑے حامی ہیں کسی نے سوال کیا کہ تم مولود و فاتحہ کو سنت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو اور جو ان سے منع کرے اس کو برا بھلا کہتے ہو۔ پھر یہ کیا وجہ ہے کہ تمہاری مستورات بہشتی زیور پڑھتی ہیں (اللہ کی شان ہے کہ اس کتاب کو سب مسلمان اپنی مستورات کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی خیال کے ہوں۔ چنانچہ ان عالم صاحب کی مستورات بھی بہشتی زیور پڑھتی تھیں) تو انہوں نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ سارا اختلاف تو اس کی خرابی ہے ورنہ حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا کہ ہر کھانے پر الگ الگ فاتحہ دی جارہی ہے پھر وہاں بیان کی فرمائش ہوئی تو میں نے اس بیان میں کہا کہ فاتحہ و درود کے سنت اور بدعت ہونے کا امتحان بہت آسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ جو مولوی صاحب مولود پڑھیں یا فاتحہ دیں ان کو کچھ نہ دیا جائے ان سے خوب مولود پڑھواؤ اور الگ الگ ہر رکابی پر فاتحہ دلواؤ۔ مگر نذرانہ کچھ نہ دو نہ مٹھائی کا دوہرا حصہ دو پھر دیکھنا وہ خود ہی اس کو فضول اور بدعت کہنے لگیں گے چنانچہ بعض لوگوں نے اس پر عمل کیا تو اسی روز شام کو آکر فاتحہ خواں صاحب کہنے لگے کہ واقعی یہ تو ایک فضول سا قصہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ فاتحہ ہو ایک ہی کافی ہے۔ میں نے جی میں کہا کہ اب تو معلوم ہو ہی گا۔ صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ ان کی آمدنی بند کرادو تو وہ خود ہی کہنے لگیں گے کہ یہ سب فضول قصہ ہے۔ یہ ساری باتیں روٹیاں کھانے کی ہیں۔ جب ایک سال طاعون کا بہت زور ہوا۔ تو میں دیکھ رہا تھا کہ چنے پڑھوانا فاتحہ دلانا اور تیجہ دسواں سب موقوف ہے۔ میں دیکھتا رہا جب طاعون کا زور ختم ہوگیا تو میں نے لوگوں سے کہا کہ کیوں جناب وہ چنے اور فاتحہ

کہاں گئے اور وہ اب وہ تیجے دسویں کیوں نہیں ہوتے۔ کہنے لگے۔ اجی ان باتوں کی کسے فرصت تھی۔ میں نے کہا چھوڑا۔ کہا نہیں۔ میں نے کہا۔ بس سمجھ لو جو کام حذف ہوگئے وہ دین کے کام نہ تھے بلکہ فرصت کی باتیں تھیں اور یہ دین کے کام تھے اس لئے کم فرصتی میں بھی ترک نہ ہوئے۔ بس خاموش ہی تو ہوگئے۔

فاتحہ مروّجہ کا نقصان

اسی طرح گاؤں کے ایک صاحب کہنے لگے کہ فاتحہ میں حرج کیا ہے بلکہ فائدہ ہے کہ اسمیں سورتوں کا ثواب بھی مردہ کو پہنچ جاتا ہے۔ میں نے کہا یہ فائدہ تو کھانے کے ساتھ مخصوص نہیں روپئے پیسے اور کپڑے میں بھی ہو سکتا ہے پھر کبھی اللہ کے نام کے روپئے پیسے اور کپڑے پر فاتحہ پڑھی کبھی نہیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں پڑھی مردہ کو فائدہ ہی ہوتا۔ سورتوں کا ثواب پہنچ جاتا۔ کہنے لگے اجی بس سمجھ میں آگیا۔ تم سچ کہتے ہو۔ صاحبو! یہ بالکل کھلی ہوئی باتیں ہیں یہ سارے قصے محض آمدنی کے واسطے نکالے گئے ہیں۔ اگر ان فاتحہ مولود پڑھنے والوں کی آمدنی بند کردی جائے تو پھر دیکھئے وہ بھی وہی کہیں گے جو ہم کہتے ہیں اس مجلس میں میں سنت و بدعت کی تحقیق بیان نہیں کی بلکہ وہ باتیں بیان کردی ہیں جو بہت موٹی ہیں جن سے ہر شخص کو بآسانی حق کا پتہ چل سکتا ہے اگرچہ بحمداللہ سنت واطاعت کی شناخت کے حقیقی اصول بھی اپنے پاس موجود ہیں ؎

؎ مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز۔
ورنہ در مجلس رنداں خبر نیست کہ نیست۔

ہاں اگر کوئی طلب ظاہر کرے اور ہمارے پاس آکر رہے تو اس کو وہ اصول بھی تبلادیں گے۔

اختلاف محل شکایت نہیں

غرض میں کہہ رہا تھا کہ اختلاف علی الاطلاق محل شکایت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ پہلے آپ حق متعین کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء مختلفین میں سے حق پر کون لوگ ہیں اور ناحق پر کون، اس طرح محقق اور غیر محقق کی پہچان ہوجائیگی۔ جس کی میں ایک آسان ترکیب تبلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ ہیں